ملاحظہ ازاری مولانا ابوالکلام آزاد
از
سید عبداللطیف
31.12.1954

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

(ذخیرۂ احادیث کی ازسرِنو جانچ)

حصّہ اول و دوم

(مرتبۂ)

ڈاکٹر سید عبداللطیف

(و منظورۂ)

کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز

حیدرآباد دکن (ہند)

سنہ ۱۹۵۴ء

ارکان کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز

(۱) ڈاکٹر سید عبداللطیف - بی - اے، پی - ایچ ڈی - (لندن) صدر

(۲) ڈاکٹر ناظر یار جنگ ایم - اے [illegible] - ڈی (ڈبلن)

(۳) ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں - ایم - اے، ڈی - فل (لیپزگ) ڈپلوما - ایل - ایس سی - (لندن) ایف - ایل - اے

(۵) ڈاکٹر زاہد علی - بی - اے، پی - ایچ ڈی - (آکسن)

(۵) ڈاکٹر عبدالمعید خاں - ایم - اے، پی - ایچ ڈی (کنٹب)

(۶) ڈاکٹر سید وحید الدین - ایم - اے، پی - ایچ ڈی (ماربرگ)

(۷) مولانا حمید الدین قمر - فاضل (دیوبند)

(۸) مولوی محمد فیاض الدین - ایف - آر - آئی - بی - اے (لندن)

(۹) مولوی نظام الدین احمد - آئی - اے - ایس -

(۱۰) ڈاکٹر محمد یوسف الدین - ایم - اے، پی - ایچ ڈی (عثمانیہ) سکریٹری

مطالعاتی علمی حلقہ

مولوی نظام الدین احمد - آئی - اے - ایس - جنرل سکریٹری)

دفتر اکیڈیمی :- ۴/۷۰ آغا پورہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

دی اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز حیدرآباد دکن (ہند)

(رجسٹر شدہ تحت حیدرآباد سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ نمبر (۱) بابتہ ۱۳۵۰ف)

قائم شدہ ۱۹۵۲ء

اغراض و مقاصد

علوم اسلامیہ کے مختلف شعبوں میں تحقیقاتی کام کرنا۔ افکار اسلامی کو جدید دنیا کے مسائل سے منطبق کرنا اور بین المذاہب و بین الثقافت مفاہمہ پیدا کرنا، اکیڈیمی کے مقاصد میں سے ہے۔ ان کے حصول کے لئے حسب ذیل ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔

۱۔ علمی تحقیق، ترجمے اور تصریحات۔

۲۔ مختلف کتب خانوں میں اسلامیات سے متعلق جو اہم کارنامے مخطوطات یا مسودات کی شکل میں محفوظ ہیں ان کی تنقیح و اشاعت۔

۳۔ اکیڈیمی کے ان اراکین کے لئے جو اکیڈیمی کے پروگرام کے تحت باضابطہ تحقیقاتی کام کرنے سے قاصر ہیں ان کی علمی دلچسپی کے لئے مطالعاتی علمی حلقوں کا قیام۔

۴۔ اندرون و بیرون ہند کے ان علمی اداروں سے تعاون جو مماثل مقاصد رکھتے ہیں۔

۵۔ اکیڈیمی کی جانب سے ایک رسالہ کی اجرائی۔

۶۔ ایک مرکزی کتب خانہ اسلامیات کا قیام۔

۷۔ دیگر ذرائع جو وقتاً فوقتاً اختیار کئے جائیں۔

نوٹ :— ہر وہ فرد اکیڈیمی کا رکن بن سکتا ہے جس نے کوئی تحقیقاتی کام کیا ہو یا اسلامیات کے کسی شعبہ میں تحقیقاتی کام کرنے کا اہل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کسی صنف یا کسی مذہب یا کسی قومیت یا ملک سے تعلق رکھے۔

ایسے خواہش مند افراد کی درخواست رکنیت پر کونسل کے دو اراکین کی سفارش لازمی ہوگی۔

محمد یوسف الدین۔ سکریٹری

حصۂ اول

یادداشتِ اکیڈیمی

دی اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز

۴/۷۰ ۔ آغا پورہ حیدرآباد دکن (انڈیا)
فروری ۱۹۵۴ء

مکرمی ۔ السلام علیکم

اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز (حیدرآباد) کی جانب سے ذریعۂ ہذا احباب کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جارہی ہے جس میں اکیڈیمی کی کونسل نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ علمی اصولوں پر جملہ احادیث کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور اس غرض کے لئے اہل علم حضرات کی ایک ایسی موزوں جماعت تشکیل دیجائے جسے پوری اسلامی دنیا کی نمائندگی حاصل ہو۔ یہ جماعت مستند احادیث کا ایک ایسا مجموعہ مُرتّب و مُدوّن کرے جو موجودہ دنیا کے تعلق سے محکماتِ قرآنی کے مطالعہ میں ضروری مدد دے سکے۔

اولین مقصد جو اس تجویز میں کارفرما ہے وہ قرآنی نظام فکر کو تمام حشو و زوائد سے پاک کرنا اور اس ذریعہ سے ایک ایسی اساس پر اسلامی افکار کو ڈھالنا ہے جو کل امت کے لئے قابل قبول ہوں اور فی الحال

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

احتسابِ نفس

قرآن نے ان لوگوں کو "امتِ وسطیٰ" کے خطاب سے سرفراز کیا ہے جنھوں نے عہدِ رسالت میں اس کی دعوت پر لبیک کہا اور ایک ایسی جدید المثال جماعت تشکیل دی جس میں کسی فرد کی قدر و منزلت کا اندازہ محض اس کی نیک اور پاکیزانہ زندگی سے کیا جاتا تھا۔ گو اس جماعت کا مقام دو انتہاؤں کے درمیان تھا۔ لیکن یہ ایک متوازن زندگی بسر کرنے کے لئے ان ہر دو سے محترز تھی، جس طرح اللہ کے رسول اس جماعت کے لئے ایک اسوۂ کمال تھے۔ اسی طرح یہ جماعت دوسروں کے لئے ایک مثال و نمونہ تھی۔ کیا دورِ حاضر میں بھی اس جماعت کا نمونہ کہیں موجود ہے ؟

جو لوگ پیروانِ رسول ہونے کے مدعی ہیں ان کی تعداد اس وقت

اسلامی نظام قوانین کی تدوین میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

اس یادداشت کے آخری فقرے میں اُن مختلف مسائل کو پیش کیا گیا ہے جو اس تجویز سے رونما ہوتے ہیں اور ان ہی مسائل کے تعلق سے آپ کی رائے درکار ہے۔

اس سلسلہ میں جو آراء وصول ہوں گے ان کے ملخّص کو شائع کر دیا جائے گا اور اس کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھی روانہ کیا جائیگا تاکہ صحیح ردِ عمل کا ایک حقیقی اندازہ آپ کو ہو سکے۔ مقصد یہ ہے کہ کسی سربرآوردہ مسلم مملکت یا کسی علمی ادارہ کی سرپرستی میں ایک ایسے اجتماع کے انعقاد کے لئے راہ ہموار کی جائے جو زیرِ نظر تجویز کو مجتہدانہ انداز میں عملی جامہ پہنا سکے۔

اکیڈیمی آپ کی ممنون ہوگی اگر آپ ازراہ نوازش اس اپیل کی وصول یابی سے اندرونِ ایک ماہ اپنے گرانقدر خیالات سے مجھے مستفید فرمایا۔

مخلص

سید عبداللطیف صدر

بدیہی حقیقت ہے کہ مسلمان موجودہ دنیا میں اُس وقت تک عزتِ نفس و خود اعتمادی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ احتسابِ نفس سے کام لے کر ان تمام چیزوں سے دستبردار ہونے کی کوشش نہ کریں جو زندگی اور فکر کی راہ میں ان کو ترقی سے روکے ہوئے ہیں۔ اس روش کو اختیار کرنے کے بعد ہی وہ خود میں اُن اوصافِ حمیدہ کی پرورش کر سکتے ہیں جو ایک ملت کو امتِ وسطیٰ کے مرتبہ پر پہنچانے کے لئے ضروری ہیں۔
سابق میں جب کبھی مسلم مفکرین نے ملتِ اسلامیہ کے تنزل و انحطاط کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی تو بلا استثناء اُن سب نے اس ایک ہی سوال کو اپنے پیشِ نظر رکھا کہ مسلمان کیوں اب ایک برسرِ اقتدار سیاسی قوت نہیں رہے۔ گویا کہ مسلمانوں کا مقصدِ حیات دوسروں پر سیاسی فرمانروائی حاصل کرنا تھا۔ ہر شخص نے اسی نکتۂ نظر سے ماضی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس بازنگاہی میں بہتوں نے مغرب کو موردِ الزام قرار دیا اور اس امر پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی معمولی سی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ کیوں اتنی آسانی سے مسلمان مغرب کا شکار ہو گئے۔ اگرچہ معدودے چند اشخاص نے اس نہج سے مسئلہ پر غور بھی کیا تو انہوں نے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کیا کہ مسلمانوں پر مذہب سے بے اعتنائی کا اتہام لگائیں۔ لیکن کیا یہ حالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی دوسری قوم مسلمانوں سے زیادہ "مذہب" کی

۳۵ اور ۴۰ کروڑ کے درمیان ہے۔ ان کے مسکن اطلانطک سے بحرالکاہل تک وسیع و عریض علاقوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ عظیم الشان منطقہ ایشیا اور افریقہ کے دو براعظموں پر محیط ہے۔ اور اس کی متعدد شاخیں شمال و جنوب میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ منطقہ معاشی اور سیاسی ہر دو حیثیت سے عظیم فیصلہ کن اہمیت کا حامل اور اینگلو امریکن و سویٹ روس کی دو حریف طاقتوں کے درمیان حائل ہے۔ جن میں سے ہر ایک اس وقت ایک دوسرے کے درپئے ہے اور اپنے اُصول و مُعتقدات کو تمام دنیا میں پھیلانے کے لئے کوشاں ہے۔ مسلمان اس وقت "اُمّتِ وسطیٰ" کا منصب حاصل کرنے اور ان ہر دو کے درمیان اختلافی خلیج کو پاٹنے کے بہترین موقف میں ہیں۔ لیکن کیا وہ اس فریضۂ منصبی کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

بدقسمتی سے وہ اس وقت نہ صرف متعدد جغرافی حد بندیوں میں مُنقسم اور مختلف سیاسی وحدتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بلکہ طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ مخالف فرقہ پرستانہ گروہ بندیوں میں مُبتلا اور انفرادی و اجتماعی طور پر کم و بیش زندگی کے ہر میدانِ عمل میں درماندہ ہیں۔ اس وقت ایک بڑا خطرہ یہ لاحق ہے کہ کہیں یہ دنیا کی دو زبردست طاقتوں کی باہمی آویزش میں فرداً فرداً گھسیٹ نہ لئے جائیں اور جو ظاہری صورت اب تک اسلام کی ان میں باقی ہے۔ اس کو بھی کھو نہ بیٹھیں۔ یہ ایک

ہم اُس قلب ماہیت اور اُسکی المناکیوں کی تفصیلات میں جائیں جن کا بدقسمتی سے وُقوع و صُدور ہو چکا ہے۔ یہ حضرات بطور خود آسانی کے ساتھ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آج کل تقریباً دنیا کے ہر حصے میں ذہن مسلم مائل بہ انحطاط ہے اور یہ محض اس لئے ہے کہ اُس زندگی میں جس کے اختیار کرنے کی قرآن اس کو تاکید کرتا ہے اور اُس زندگی میں جو اس نے اپنے لئے خود وضع کرلی ہے، ایک فصل ہے۔ اسی طرح اُن سماجی اور سیاسی اداروں میں جن کی تعمیر کی ہدایت قرآن مجید نے کی ہے اور اُن ادارو میں جن کی خود اس نے اپنے لئے بنا ڈالی اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ انھیں آگے بڑھایا ہے، ایک فصل ہے۔ یونہی عہد حاضر کے مسلمانوں کے مقصدِ حیات یعنی ان کی مذہبی تنگ نظری اور انفرادیت اور قرآن کے منشاءِ جاوداں کے مابین جو ایک عالمی حیثیت اور عام انسان دوستی کا حامل ہے ایک بہت بڑا فصل ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چند ہی سال بعد جیسے ہی ان کی قائم کی ہوئی مملکت جس کو خلفائے راشدین نے جمہوری طرز پر چلانے کی کوشش کی جبر و استبداد کے ذریعہ بنی امیہ کے قبضہ میں آگئی۔ اُس عظیم انحطاط کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کی پہلی صدی ہی کو اسلام کے سب سے زیادہ آزمائش و ابتلا کا دور سمجھا جاتا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے والے عرب ایک وسیع و عریض سلطنت کے مالک بن گئے جس میں ہر قسم کی ترغیب

پرستار نہیں پھر بھی وہ کئی صدیوں سے پستی و تنزل میں مبتلا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو ان کی موجودہ پستی کی ذمہ دار ہے؟ یہ جو کبھی دوسروں کے لئے نمونہ اور مثال تھے اب کیوں ان کی یہ حیثیت برقرار نہیں رہی؟ ان کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ وہ یہ کہ جن اوصافِ حمیدہ نے اُن کو کسی وقت ایک مثالی اُمت ہونے کا امتیاز بخشا تھا، اب ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ کیونکہ یہ اوصاف اُن اجنبی صفات کے پہلو بہ پہلو باقی نہیں رہ سکتے تھے جن کو مسلمانوں نے رفتہ رفتہ اپنا لیا۔ یہ وہ صفات ہیں جنھوں نے ابتداء میں تو کیف آور اثر مرتب کیا، لیکن بالآخر ان کی صلاحیتوں کو سلب کر دیا۔ یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک ایسے ذہنِ انسانی کی تخلیق کی جائے جس میں احساسِ توحید ربانی احساسِ وحدتِ انسانی کی ایک غیر متزلزل حیثیت اختیار کر سکے تاکہ ہر شخص اپنے عملِ صالح، تقویٰ یا متوازن اعمال کے ذریعہ حقوق اللہ اور حقوق العباد یا حقوق النّاس کی بجا آوری کا اہل ہو۔ ایسے افراد جو ان صفات کے حامل ہوں یقیناً مسلم معاشرہ میں اب بھی موجود ہیں لیکن کیا اجتماعی حیثیت سے بھی دنیائے اسلام ایسا ہی نمونہ پیش کرتی ہے؟

(۲)

چونکہ یہ یادداشت اہلِ علم حضرات کے لئے ہے جو خود حالات کا پوری طرح علم رکھتے ہیں، لہٰذا اس امر کی چنداں ضرورت نہیں کہ

اپنی اُمت کے سپرد فرمایا تھا۔

اس طرح قرآنی دین جس نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی تھی کہ اللہ کی رسی کو باہم ملکر مضبوطی سے پکڑے رہو، ایک ایسی متحدہ زندگی بسر کرو جو دوسروں کے لئے نمونہ ہو وہ خود اپنے متبعین ہی کے ہاتھوں ایک منقسم ومنتشر زندگی کی خدمت کا آلۂ کار بن گیا۔

کیا اسلام پھر ایکمرتبہ اُمتِ واحدہ کی حیثیت اختیار کرسکتا ہے؟ اور بطور ایک اُمتِ وسطیٰ کے عمل پیرا بن سکتا ہے؟ یہ ایک ایسی پُرحسرت پُکار ہے جو اس وقت ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ بالفاظ دیگر کیا عالم اسلام کے ایک ہی شریعت پر واپس آنے کی کوئی توقع ہوسکتی ہے، یا کم از کم کیا ہم اپنے زمانہ میں اُن نقابوں کو جو قرآن پر ڈال دیئے گئے ہیں اور جن سے مرقعِ رسالت دُھندلا ہوگیا ہے، اُٹھا کر اس مقصد کے حصول کے لئے راہ ہموار کرسکتے ہیں؟

(۳)

لیکن سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کس طرح اُٹھایا جائے اور ان کو کون اُٹھائے؟ کیونکہ یہ پردے اُن روایات سے پیوستہ ہیں جن کو ذاتِ رسالت سے منسوب کردیا گیا ہے۔ اس طرح نبی کریم صلعم کے صحیح احادیث کو اُن روایات سے جنھیں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حریف سیاسی جماعتوں اور برسرپیکار فرقوں نے وضع کیا تھا، کس طرح ممیز کیا جائے؟ یہ صحیح ہے کہ ہمارے پاس احادیث کے ایسے مجموعے

وتحریص کا سامان موجود تھا۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ وہ ان کے شکار ہوگئے۔ نتیجہ باہمی خانہ جنگیوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سارے نزاع کا مرکز مسئلہ خلافت تھا۔ نیتوں کی جانچ یا ذمّہ داریوں کے تعین کا یہ محل نہیں۔ کئی تکلیف دہ صدیاں درمیان میں حائل ہیں، اُن کو عبور کرکے اُن چیزوں کی خواہ مخواہ کھوج لگانا سعی لاحاصل ہوگا۔ بہرحال نتیجۃً اسلام فرقہ بندی میں مبتلا ہوگیا۔

ان خانہ جنگیوں کے دوران میں قرآنی تصورات سے گریز کرنے کا جو رجحان پیدا ہو چلا تھا، وہ بنو اُمیہ کی خاندانی خلافت اور اس کے بعد آنے والے عہدِ عباسیہ میں شدید تر ہوگیا اور جب بیرونی ثقافتی اثرات اس میں خلط ملط ہوگئے تو وہ اس روپ میں نمایاں ہوا جو اسلام کے روایتی بہتر فرقوں کے نام سے موسوم ہے۔ اس رجحان کے شاخسانہ کے طور پر نیز اس کو پرورش کرنے والی قوت کی حیثیت سے مختلف فرقوں کے سرگرم طرف داروں میں یہ عام میلان پیدا ہوگیا کہ جہاں استدلال عاجز آجائے وہاں رسول کریمؐ کے نام کا سہارا لیا جائے اور ان حریفانہ دعاوی اور نقاطِ نظر کی تائید میں ایسے اقوال و افعال کو رسول کریمؐ سے منسوب کیا جائے جو بالکلیہ انھیں کی شادابیٔ دماغ کا نتیجہ تھے۔ اس کا نتیجہ مختلف نظامِ فقہ و شرع اور رسم و رواج کی شکل میں رونما ہوا اور ہر ایک کو مذہب کا لقب دیا گیا، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں وہ دین یعنی قرآن کا اسلام نہ تھا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وداعی خطبہ میں

اٹھایا جائے اور ہمارے افکارِ زندگی کی از سرِ نو ترتیب عمل میں لائی جائے تو اس کام میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ جدید علمی اصولوں پر روایتوں کی از سرِ نو چھان بین کی جائے۔ اور ان سے ایک واحد مستند مجموعہ تیار کیا جائے۔

یہ ایک ایسا کام ہے۔ جس کو کُل عالمِ اسلام کے قابل ترین اربابِ علم کی ایک موزوں جماعت ہی سر انجام دے سکتی ہے۔ یہ کام مسلم ممالک کی حکومتوں اور اُن کے نمائندہ اداروں کا ہے کہ اس قسم کی تحقیقات کیلئے کسی موزوں مقام پر ایک متفقہ پروگرام مرتّب کریں۔ تا وقتیکہ روایات کی مزید تنقیح نہ ہو اور کھرے کھوٹے کو ایک دوسرے سے جُدا نہ کر دیا جائے، افکارِ اسلامی کی از سرِ نو تشکیل کی ہر کوشش محض پیوند دوزی ہوگی، جیسا کہ ماضی اور حال کی ان کوششوں کا انجام ہوا ہے جو وقتاً فوقتاً اجتہاد کے نام سے کی گئی ہیں۔ یہ حشو و زوائد زیادہ تر یہودی، مجوسی، نسطوری اور اشراقیت کی پیداوار ہیں جن کو دانستہ طور پر آنحضرت صلعم سے منسوب کیا گیا ہے اور جس کے نتیجے کے طور پر ایسے معتقدات کی نشوونما عمل میں آئی جو قرآن کی حقیقی روح کے سراسر منافی تھے۔ جب تک کہ اصل کو غیر اصل سے جُدا نہ کیا جائے اور حدیث کے موجودہ سرمایہ سے ایک ایسا واحد مستند مجموعہ تیار نہ کیا جائے جو قرآنی ہدایات کے فہم و ادراک میں اسی طرح ممد و معاون ہو جس طرح کہ عہدِ رسالت میں انھیں رُوبہ عمل لایا گیا تھا، اس وقت تک موجودہ دنیا میں اسلام کے مذہبی افکار کی تشکیلِ جدید

موجود ہیں جو "صحاح" کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں اور جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کے مستند احادیث ہیں۔ بلاشبہ یہ بڑی محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی تدوین و ترتیب کا کام کس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ اس سادہ واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے جو ان میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جب صحیح و سقیم روایات کی چھان بین اور ان کی تدوین کا کام شروع کیا تو منجملہ اُن چھ لاکھ حدیثوں کے جو اُن کے علم میں آئیں، بروایت ابن خلکان بجز ۷۲۹۷ یا ایک دوسری روایت کے بموجب صرف ۷۲۹۵ احادیث کو انھوں نے صحیح تسلیم کیا اور باقی تمام کو غیر مستند قرار دیا۔ اگر اعادہ و تکرار کو نظر انداز کیا جائے تو یہ تعداد بھی گھٹ کر صرف ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ کم و بیش دیگر مؤلفین کی بھی اس معاملہ میں یہی سرگذشت ہے۔ بایں ہمہ یہ صحاح ستہ بھی آنحضرت صلعم کے صحیح ذہنی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے میں کچھ زیادہ ممد و معاون نہیں ہیں۔ اختلافات اور تضاد سے قطع نظر ان میں ہم بعض ایسی روایات سے بھی دوچار ہو جاتے ہیں جو نہ صرف قرآن کے اساسی رجحانات سے متصادم ہوتی ہیں۔ بلکہ جو تصویر آنحضرت صلعم کی سیرت و کردار کی قرآن میں پیش کی گئی ہے، اس کے یہ بالکل برعکس ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انتخاب کا معیار عملاً داخلی (Subjective) نوعیت کا تھا۔ جس میں زیادہ تر راویوں کے ظاہری زہد و تقویٰ کو دیکھا جاتا تھا۔ اور خارجی (Objective) طریقہ کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اگر ان پردوں کو

ونظر کو صرف صحاح کی چاردیواری میں محدود رکھیں۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان مجموعوں کو ترتیب دینے والے اپنے انتخاب میں عملاً داخلی طریقۂ کار پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں جن روایات کو رد کر دیا گیا ہے۔ ان میں بعض ایسی حدیثیں ہوں جو اپنے معنوں کے لحاظ سے یا اپنی داخلی شہادت کی بناء پر صحیح سمجھی جانے کی مستحق ہوں۔ ایک شخص جو دوسروں کو دکھانے کے لئے تقدس کا روپ اختیار نہیں کرتا ضروری نہیں کہ محض اس پاداش میں اس کو ساقط الاعتبار راوی فرض کر لیا جائے۔ بعض اوقات کذب و دروغ گوئی کا خوگر بھی سچ بول دیتا ہے۔ تحقیقات علمی کے دائرہ میں اُن چیزوں کی حیثیت دیکھی جاتی ہے جو دریافت و تحقیق کے لئے پیش ہوتی ہیں نہ کہ اس شخص کی عام شہرت جو ہمارے نقد و نظر کے لئے کوئی چیز لاتا ہے گو یہ چیز ہمیں محتاط رہنے میں ضرور مدد دیتی ہے۔ اگر علمی تحقیقات کا مطمح نظر یہی ہو تو تحقیقات کرنے والی جماعت کو یقیناً صحاح کے علاوہ اپنے نقد و نظر کیلئے دیگر متعلقہ ذخیروں کو بھی دائرہ تحقیق میں لانا پڑے گا۔

یہ دیگر مجموعے مختلف نوعیتوں کے ہیں۔ خود صحاح ستہ کی تالیف و تدوین سے قبل ان روایات کا بیشتر حصہ زبان زد خاص و عام ہو چکا تھا۔ اور اس سے آنحضرت صلعم کی سوانح حیات اور اس وقت کی عام تاریخوں اور فقہ کی کتابوں کے لئے بطور مواد کام لیا جاتا تھا۔ ان روایات کا ایک معتدبہ حصہ جنہیں صحاح ستہ نے ناقابل اعتبار سمجھ کر چھانٹ دیا تھا

اور تمام اُمت کے لئے اسی اساس پر ایک واحد بُنیادی فقہ کی تدوین کی کوشش ہرگز بار آور نہ ہوسکیگی۔

یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن عالمِ اسلام کو اگر ایک ملتِ واحدہ کی طرح صفائی قلب اور تازہ توانائیوں کے ساتھ اُمتِ وسطیٰ کا فریضہ انجام دینا ہے یا ایک ایسی دنیا میں جو انتہائی متضاد فلسفوں میں پارہ پارہ ہو چکی ہے، ایک توازن قائم رکھنے والی قوّت کی حیثیت سے دوبارہ سربلند ہونا ہے، تو ہمت و جرأت سے اسے ایسا کرنا ہی ہوگا۔ اگر ماضی میں ایک تن تنہا روایتوں کے جمع کرنے والے کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ بے یار و مددگار محنت و عرق ریزی سے ان روایتوں کی چھان بین کر کے ان کو ضبطِ تحریر میں لاسکے، تو یہ کام علمائے جدید کی ایک ایسی جماعت کیلئے قطعاً دشوار نہیں ہے۔ جو مذہب کے تقابلی مطالعہ میں دستگاہ رکھتی ہو اور جس کی اعانت کے لئے اصولِ تحقیق سے باخبر اور قابلِ اعتماد عملہ موجود ہو۔ صرف ایک غیر متبدل قرآن، ایک مستند مجموعۂ احادیث جس کو ترجمہ کے ذریعہ ہر مسلمان تک پہنچایا جاسکے، اور ایک نصب العین جس کی پابندی ساری اُمت پر لازم ہوسکے، ہی کے توسط سے اسلام پھر ایکمرتبہ اپنے اصلی خدوخال میں رُونما ہوسکتا ہے اور تمام نوعِ انسان کے لئے امن و سلامتی اور دائمی وحدت کی ایک بے پناہ قوت بن سکتا ہے

(۴)

مُستند احادیث کی تعیین و تشخیص میں یہ کافی نہ ہوگا کہ ہم اپنی تلاش

L 2026

جائیگی کہ انھیں دوبارہ اُبھرنے کا موقع حاصل نہ ہو سکیگا۔ جمود اپنے انتہائی حدود تک پہنچ چکا ہے یا تو اس کو خود بخود اپنی فطری قوت سے دوبارہ رواں ہونا پڑے گا یا پھر یہ ریگ صحرا میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ احادیث کی نوعیت پر از سر نو تحقیقات کی تحریک کے متعلق مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے علماء اور حضرات صوفیاء کیطرف سے سخت مخالفت کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض حضرات صورت حال کی نزاکت کو محسوس کر کے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیں۔ پھر بھی ایک بہت بڑا طبقہ 'خاص کردہ لوگ جنھوں نے مذہب کو ایک پیشہ بنا لیا ہے اور جو ہماری طرز فکر اور طرز زندگی میں قرون وسطیٰ کے روایات کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس تجویز کا شدت سے مقابلہ کریں گے مگر بحیثیت مجموعی ہمیں اچھائی کی توقع رکھنی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی ایک دن نرم پڑ جائیں۔ ویسے تو انھیں دین میں جو آمیزش ہوئی ہے' اس سے اس کو پاک کر دینے پر خوش ہو جانا چاہیئے اور اسکے نتائج سے روحانی فیض حاصل کرنا چاہیئے۔ بہر نوع وقت اس امر کا شدت سے متقاضی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دیں۔ اگر ہم دنیائے مستقبل میں زندگی کے خواہاں ہیں تو بہر حال مفادات حاصلہ کی تمام مخالفتوں کے باوجود ہمیں پہلا قدم تو اس جانب اُٹھانا ہی پڑیگا۔ درحقیقت اسلام کے لئے وہ دن بڑا ہی مبارک دن ہوگا۔ جبکہ ہمارے علماء خود آگے بڑھ کر اس تحریک کی رہنمائی اور قیادت فرمائیں!

یہ یادداشت سربرآوردہ مسلم اربابِ علم، اربابِ صحافت، اربابِ قانون

وہ بھی غالباً یا تو ان ماخذ میں موجود ہے یا ان ذخیروں کا حجم وضخامت بڑھانے
کا باعث ہوا ہے جو بعد میں جمع کئے گئے۔ خاص کر وہ مجموعہ جو کنز العمال کے نام
سے مشہور ہے اور جس کی اشاعت ۱۳۱۲-۱۳ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد
دکن سے ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ ان روایات کے مجموعوں کا بھی اضافہ
کیا جا سکتا ہے جن کے حامل شیعوں کے مختلف فرقے ہیں۔ خاص کر وہ روایات
جو اثناء عشری ذخیرہ موسومہ "بحار الانوار" میں محفوظ ہیں یا "تفسیر صافی" میں
جن کے حوالے پائے جاتے ہیں یا فقہ کی کتابوں مثلاً بصائر الدرجات من لا یحضر
الفقیہ" اور "کافی کلینی" میں جن کا اندراج ہے۔ اسماعیلیوں کے ہاں بھی
بہت سی ایسی روایتیں مروج ہیں جو ان کے غیر مطبوعہ دینیاتی ماخذوں میں
موجود ہیں اور جن میں سے بعض اس وقت تک منظر عام پر بھی آچکی ہیں۔

یہ اتنا وسیع اور گوناگوں مواد ہے جس کی کانٹ چھانٹ اور چھان بین ضروری ہے
جب علماء کی ایک نمائندہ جماعت کے ذریعہ مستند احادیث کا ایک
مجموعہ تیار ہو جائے گا تو آنحضرت صلعم کے عہد مبارک میں جس طرح قرآنی محکمات
پر عمل ہوا کرتا تھا۔ اسکی صحیح تصویر کے مطالعے کی راہیں خود بخود کھل جائینگی
اس کے ساتھ ہی تمام امت کے لئے ایک مشترکہ اساس پر فقہ کی ترتیب
و تدوین کا کام بھی آسان ہو جائیگا جس کے بغیر دور حاضر میں اسلامی دنیا کیلئے
ایک "امت وسطیٰ" کے فرائض انجام دینا مشکل ہے۔ اگر مسلمان مشاہدہ باطن
کے جذبہ کو فروغ دینے میں کوتاہی کریں اور اپنے ذہن و زندگی کی تطہیر پر
آج آمادہ نہ ہوں تو بیرونی دنیا میدان عمل میں کل کے دن اتنی آگے نکل

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

(ذخیرۂ حدیث کی ازسرِنو جانچ)

حصّۂ دوم

ارباب علم کی آراء کا تنقیدی ملخّص

مرتبہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف

ومنظورۂ

کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز

حیدرآباد دکن (ہند)

۱۹۵۴ء

اور مختلف ممالک کے اصحاب حل و عقد کی خدمت میں جنکو نمائندہ حیثیت حاصل ہے، روانہ کی جاری ہے اور تجویز یہ ہے کہ ان سب کے تاثرات کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں جو رجحانات اسوقت کارفرما ہیں، ان کا انکشاف ہو سکے اور کسی مرکزی مقام پر ایک عالمی مسلم اجتماع کے انعقاد کیلئے راہ ہموار کیجا سکے اور اس ذریعہ سے شاید یہ تجویز ایک محسوس شکل اختیار کر سکے امید ہے کہ ذیل کے عنوانات پر جناب والا اپنی قیمتی رائے سے مستفید فرمائیں گے۔

۱۔ کیا احادیث کے سارے ذخیرہ کی از سر نو جانچ اور احادیث نبوی کے ایک مستند مجموعہ کی ترتیب و تدوین ضروری ہے ؟

۲۔ اس کام کی تکمیل کے لئے طریقۂ تحقیق کیا ہونا چاہیے ؟

۳۔ مجوزہ مجلس تحقیق کی تشکیل کیونکر عمل میں لائی جائے ؟

۴۔ مجلسِ تحقیق کس قسم کے ارکان پر مشتمل ہو ؟

۵۔ فرائضِ مجلس کی تعیین ؟

۶۔ تحقیقات علمی کے انتظامات اور ان کے نتائج کی نشر و اشاعت کیلئے سرمایہ کی فراہمی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے ؟ فقط

سید عبد اللطیف

صدر اکاڈیمی

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

ذخیرۂ حدیث کی ازسرنو جانچ

سال رواں کے ابتدائی مہینوں جنوری اور فروری میں مجھے اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کی کونسل کی جانب سے دنیا کے مختلف حصّوں میں بسنے والے سربرآوردہ مسلم اربابِ علم، اربابِ صحافت، اربابِ قانون اور اربابِ حل وعقد کی توجہ کونسل کی منظور کردہ اس یادداشت کی طرف منعطف کرانے کا شرف حاصل ہوا تھا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ احادیث کے سارے ذخیرہ کا علمی اصولوں پر ازسرنو جائزہ لیا جائے اور قابل ومستند اصحاب علم کی ایک ایسی جماعت جس کو پورے عالمِ اسلامی کی نمائندگی حاصل ہو، احادیث صحیحہ کا ایک ایسا واحد مصدقہ مجموعہ تیار کرے جو موجودہ زمانے کے تعلق سے محکماتِ قرآنی کے فہم ومطالعہ میں مدد دے سکے۔ اولین مقصد جو اس تجویز میں کارفرما تھا وہ قرآنی نظامِ فکر کو تمام حشو وزوائد سے پاک کرنا اور اسکے ذریعہ ایک ایسی اساس پر اسلامی افکار کو ڈھالنا تھا جو کل امت کے لئے

"طلوع اسلام" لاہور کے "تجدید عہد" و "اسلامک لٹریچر" بجنور کے "مدینہ" دہلی کے "تبلیغ" اور کلکتہ کے "نوٹس آن اسلام" جیسے کثیر الاشاعت اخبارات ورسائل نے خود اپنے طور پر اس یادداشت کو شائع کرکے اسکے پیام کو روشن خیال طبقہ کے ایک نہایت ہی وسیع حلقہ تک پہنچا دیا۔ ہمیں دراصل ان حضرات کا تاثر معلوم کرنا تھا اور انہی کے جوابات مطلوب تھے جو کسی نہ کسی طرح حدیث سے شغف رکھتے ہوں اور حدیث کی تحقیق اور اس کی چھان بین میں مصروف رہے ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس مقصد کے تحت جو جوابات وصول ہوئے ہیں وہ ہر طرح تشفی بخش قرار دئے جاسکتے ہیں۔ اس یادداشت کی تائید ایسے حلقوں سے بھی ہوئی ہے۔ جہاں سے کسی قسم کے جواب کی کوئی توقع نہیں کیجا سکتی تھی۔

اس وقت تک جو جوابات وصول ہو چکے ہیں ان میں سب سے زیادہ تعداد بلحاظِ ترتیب ہندوستان، پاکستان اور مصر کی ہے۔ عالمِ اسلامی کے باقی علاقوں سے جو جوابات وصول ہوئے وہ اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن نمائندہ حیثیت کے حامل ہیں اور ان حضرات کے لئے جو اسلام اور عالمِ اسلامی کے موجودہ مذہبی بحران کے مطالعہ میں مصروف ہیں، ان جوابات میں نہایت ہی معنی خیز اشارات موجود ہیں۔

اب یہاں موصولہ آراء وافکار کا ایک تنقیدی خلاصہ ان احباب کے لئے پیش کیا جارہا ہے جنھوں نے اکیڈیمی کی یادداشت کا جواب روانہ فرمایا ہے۔ تبصرہ کے اختتام پر بلحاظ ترتیب ان احباب کے ناموں

خصوصاً میدانِ قانون میں قابلِ قبول ہو سکے۔ اس یادداشت میں مندرجہ ذیل امور کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو اس تجویز سے رونما ہوتے تھے اور جن کے متعلق رائے طلب کی گئی تھی :—

۱۔ کیا حدیث کے سارے ذخیرہ کی از سرِ نو چھان بین اور احادیث نبوی کے ایک واحد مصدقہ مجموعہ کی ترتیب و تدوین ضروری ہے؟

۲۔ طریقہ تحقیق کیا ہونا چاہیئے؟

۳۔ مجوزہ مجلسِ تحقیق کی تشکیل کیونکر عمل میں لائی جائے؟

۴۔ مجلس تحقیق کس قسم کے ارکان پر مشتمل ہو؟

۵۔ فرائض مجلس کی تعیین۔

۶۔ تحقیقاتِ علمی کے انتظامات اور انکے نتائج کی نشر و اشاعت کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

(۱)

اس یادداشت کے سلسلے میں جو جوابات وصول ہوئے ہیں انکی تعداد بہت زیادہ نہیں اور توقع بھی ایسی ہی کی گئی تھی۔ جن حضرات کے پاس یہ یادداشت بھیجی گئی تھی ان کی ایک کثیر تعداد نے بظاہر ایک ایسے موضوع پر جسکی اجارہ داری ایک عرصۂ دراز سے پیشہ ور علماء ہی کے ہاتھوں میں چلی آ رہی تھی، اپنے کسی خیال کے اظہار میں پس و پیش سے کام لیا۔ انکے پاس یادداشت کو محض علمی اور اطلاعی غرض کے تحت بھیجا گیا تھا، اور یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ لندن کے "اسلامک ریویو" کراچی

رجحان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پہلے ہی سے ترکی میں ایک ٹھوس شکل اختیار کر چکا ہے اور اپنے اثر کو دنیائے اسلام کے دیگر حصوں تک پھیلاتا جا رہا ہے۔ یہ رجحان دراصل ایک دوسری وسیع تر تعقلی تحریک کا جزو ہے جس کا مقصد قانون کو مذہب سے علیحدہ کرنا اور سماجی زندگی کو غیر مذہبی بنانا ہے۔

وہ حضرات جو دوسری اور تیسری قسم کے تحت آتے ہیں اُس اسلام کے قوی ردّ عمل کی نمائندگی کرتے ہیں جو بالخصوص روایات کے زیر نگیں ہے، اسطرح ان میں اور اُن حضرات میں جو پہلی قسم کے تحت آتے ہیں قطبین کا فاصلہ حائل ہے
رابعاً مفکرین کی وہ جماعت ہے جو ایک طرف روایتی اسلام سے اپنے جذباتی لگاؤ اور دوسری طرف مغربیت سے اپنی ذہنی وارفتگی کے درمیان ایک تذبذب کی حالت میں ہے۔ وہ حضرات جو اپنے آپ کو اس تکلیف دہ حالت میں محسوس کرتے ہیں وہ داخلی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے طرز جدید سے ہم آغوش ہونے کے آرزومند ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ رجحانات کے مندرجۂ بالا تجزیہ کی ایک حد تک تائید موتمر ثقافتِ اسلامی کی اُس روئداد سے بھی ہوتی ہے جس کا انعقاد ممالک متحدہ امریکہ میں ماہ ستمبر ۱۹۵۳ء میں پرنسٹن یونیورسٹی اور لائبریری آف کانگریس واشنگٹن کی مشترکہ سرپرستی میں عمل میں آیا تھا اور جس کا میں اس تجزیہ کے دوران میں ضمناً حوالہ دیتا رہوں گا۔

ان ہی مختلف رجحانات کے مدنظر اکیڈیمی نے ۱؎ غور اپنی یہ تجویز پیش کی۔

اور پتوں کی ایک فہرست بھی شریک ہے اور اسمیں اُن غیر مسلم مستشرقین کے ناموں کو بھی شریک کر لیا گیا ہے جنھوں نے اس تجویز سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے و نیز اس کی تدریجی صورتِ حال سے باخبر رکھے جانے کی اِستدعا کی ہے۔

موصولہ جوابات کی ایک بڑی تعداد اس تجویز کی تائید میں ہے لیکن اِن پر بحث کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان بقیہ جوابات کو بطورِ خاص جانچ لیا جائے اِس لئے کہ ان سے اُن انقلابی اور رجعت پسند رجحانات کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت جسدِ اسلام میں کارفرما ہیں۔ یہی وہ رجحانات ہیں جو درحقیقت اکیڈیمی کی پیش کردہ تجویز کے محرک اور اسکا باعث ہوئے ہیں

ان میں اولاً وہ حضرات ہیں جو حالتِ موجودہ میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہاں و روادار نہیں، جو سراسر روایات پرست ہیں جو روایتی اسلام میں مزید شدت پیدا کرنے کو مرجح خیال کرتے ہیں۔

ثانیاً ان حضرات کی جماعت ہے جو احادیث و روایات کے سارے ذخیرہ کو ظنی کہہ کر اور دینِ اِسلام کے لئے اِس کو غیر اہم قرار دیکر مسترد کرتی ہے اور قرآن کو اپنے لئے کافی سمجھتی ہے۔

ثالثاً وہ حضرات ہیں جو اس مکتبِ خیال کی علمبرداری کر رہے ہیں کہ روایتی اسلام کے اس سارے ڈھانچہ کو نظر انداز کر دیا جائے جس کی تعمیر تاریخ کے مختلف ادوار میں قرآن و حدیث کے تفاعل سے ہوئی ہیں اور صرف اسلام کی "روح" یا اس کے "جوہر" پر قناعت کر لی جائے۔ اِس

(۴) مولوی محمد رحیم الدین صاحب، سابق پرنسپل ورنگل کالج،
حیدرآباد اسٹیٹ، جنھوں نے "الموطا" کا انگریزی میں ترجمہ
کیا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر فرخ صاحب لکھتے ہیں:۔

" میرے خیال میں اس انداز پر کسی کام کو انجام دینا محض وقت "
" اور محنت کو رائیگاں کرنا ہے۔ ہر وہ نکتہ یعنی چھان بین، تشخیص "
" وانتخاب، تمام ممکنہ طریقوں اور ضروریات کا انتظام وغیرہ اشارے "
" جسکی طرف آپ نے اپنی تجویز میں اشارہ کیا ہے، تو یہ ہمارے "
" شاندار ماضی میں ضرور کسی نہ کسی بلند پایہ مصنف کی عالمانہ وسیر حاصل "
" بحث کا جزو بن چکے ہیں"۔

بایں ہمہ مزید وہ لکھتے ہیں کہ:۔

" جدید خارجی طریقۂ تنقید کے بموجب احادیث کی ازسرنو ترتیب "
یقیناً ایک بالکل جداگانہ موضوع ہے"۔

پروفیسر ایم۔اے عمراوی صاحب نے اس موضوع پر جواب ادا کرنے کی بطور خاص زحمت اٹھائی ہے لیکن جو کچھ انہوں نے طویل خط میں تحریر فرمایا ہے وہ گو دلچسپ ضرور ہے لیکن وہ اس مسئلہ سے غیر متعلق اور اس کے دائرہ سے خارج ہے جس کے لئے بطور خاص دعوتِ فکر دی گئی تھی۔ بہرحال انہیں فنی میکانی طریقہ پر قدرے تبدیلی کے ساتھ ذخیرۂ حدیث کی مکرر تبویب و ترتیب سے کوئی اختلاف نہیں۔ ان کا

تھی کہ احادیث کے سارے ذخیرہ کو ان تمام چیزوں سے پاک کر دیا جائے جو قرآن کے لئے بیگانہ ہیں تاکہ قرآن و حدیث کے درمیان ایک ایسا مربوط باہمی تعلق قائم ہو سکے جو عہدِ حاضر کے تعلق سے بطورِ خاص دائرۂ قانون میں اسلامی افکار کی تشکیلِ جدید کے لئے بطورِ تمہید کام دے سکے۔

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر گفتگو کروں جو خود اپنی جگہ ایک مستقل رجحان تصور کیا جا سکتا ہے، میں یہاں اولاً مذکورہ رجحانات سے سلسلہ وار بحث کروں گا۔

(۲)

پہلا گروپ

ہماری فہرست کے مندرجۂ ذیل چار مکتوب نگار اُن حضرات کی نمائندگی کرتے ہیں جو حالتِ موجودہ سے مطمئن ہیں۔ یا ذخیرۂ حدیث پر کسی قسم کی تحقیق آغاز کئے جانے کے مخالف ہیں۔

(۱) ڈاکٹر عمر، اے، فرخ صاحب، رکن عرب اکیڈیمی دمشق۔

(۲) پروفیسر ایم، اے غمراوی صاحب، سابق صدر شعبۂ کیمیا، قاہرہ یونیورسٹی۔

(۳) ڈاکٹر ایم، حمید اللہ صاحب جو کسی وقت جامعہ عثمانیہ میں بین الاقوامی قانون کے استاد رہ چکے ہیں اور کتاب "اسلامی نظامِ حکومت" کے مصنف ہیں اور اس وقت پیرس میں سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ اور

" کریں گے جیسے کہ ہم اس وقت بخاریؒ اور مسلمؒ جیسے ذی مرتبت "
" علماء پر نکتہ چینی کر رہے ہیں"۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔

" اس لئے میں ایک دوسری ہی تجویز پیش کرتا ہوں یعنے حدیث "
" کے تمام ذخائر کو یکجا کر کے اس کا ایک مکمل مجموعہ شائع کیا جائے "
" باوجود اس کے کہ اس خصوص میں ہمارے اسلاف کے گراں قدر "
" کارنامے موجود ہیں، ابھی اس میدان میں بہت کچھ کام کرنے کی "
" گنجائش باقی ہے۔ (نیز اس امر کی ضرورت ہے کہ نبی کریم صلعم کی "
" ذاتِ گرامی سے جن احادیث کا صدور عمل میں آیا ہے۔ ان کے "
" مجموعوں کا ایک صد مجموعہ تیار کیا جائے۔ میرا مطلب ایک ایسے "
" مجموعہ سے ہے۔ جس میں کسی حدیث کے جملہ ماخذ و اسناد کے صرف "
" حوالے ہی نہیں بلکہ اس حدیث کے دیگر اختلافی نسخے بھی موجود ہوں "
" اور یہ مجموعہ ایک مبسوط اشاریئے پر مشتمل ہو"۔ مزید وہ لکھتے ہیں :۔

" ہر حدیث کو تاریخ وار مرتب کیا جائے۔ یعنی اس عہد کے مطابق "
" جس میں کہ محدث نے اس حدیث کی روایت کی ہے"۔ ان کا خیال "
" ہے کہ اگر ایک ہی حدیث کے مکررات کو نظر انداز اور خارج "
" کر دیا جائے تو" موجودہ احادیث کی تقریباً ایک لاکھ تعداد "
گھٹ گھٹا کر صحیح بخاری کی موجودہ ضخامت پر آجائے گی"۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی یہ تجویز کہ جملہ احادیث کو یکجا کیا جائے

خیال ہے کہ :۔

(الف) وہ روایات جو "متواتر" کہلاتی ہیں ان کو جمع کیا جائے

(ب) متناقص احادیث کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس کو بغرض تاویل و توضیح "علمائے حدیث" کے پاس ارسال کیا جائے۔

اس کے علاوہ انہوں نے چند اور ذیلی تجاویز بھی پیش کی ہیں جو مذکورۂ بالا دو تجاویز ہی سے متعلق ہیں۔

پروفیسر خمراوی صاحب کی رائے ہے کہ اگر ہر فرقہ کے مجموعۂ احادیث کے متعلق یہ طریقۂ عمل اختیار کیا جائے تو تقابلی طور پر نتائج کی جانچ ممکن ہو سکے گی اور اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ درحقیقت اسلامی فرقے ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں اور کہاں تک ان کو احادیث کے، جو بلحاظ نوعیت و قسم تمام اسلامی فرقوں میں مشترک ہیں، ایک یا ایک سے زیادہ مسلّمہ مجموعوں کے ذریعہ باہم قریب تر لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ :۔

"ایسے اصحاب علم کی جماعت کے ملنے کا کم امکان ہے جنھیں"
"تمام عالم اسلامی میں مسلّمہ حیثیت حاصل ہو اور اس سے بھی کم"
"امکان ان کے باہم کسی متفقہ نتیجہ پر پہنچنے کا ہے۔ آئندہ نسلوں"
"کی بابت تو کچھ کہنا ہی بے سود ہے جبکہ مستقبل کے مستند و متدین"
"محققین موجودہ عہد کے ارباب علم کی تجاویز و آرا پر ایسی ہی نکتہ چینی"

ہر موقع پر ذاتِ گرامی پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ ایسی قطع وبرید کے بغیر احادیث کا وہ صدر مجموعہ جس کی ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے سفارش کی ہے اور جو فنی طور پر ترتیب دئے ہوئے اشاریہ پر بھی مشتمل ہوگا یقیناً نکتہ چینان اسلام کے لئے ایک نہایت ہی دلپسند غیر مقدمی تحفہ ہوگا اس لئے کہ وہ بغرض اعتراض ونکتہ چینی اس میں اس کے باقاعدہ ترتیب دئے ہوئے اشاریہ کی مدد سے اپنی دل بہلائی وتفریح کا پورا سازوسامان فوری استعمال کے لئے ہر وقت موجود پائیں گے۔

مولوی محمد رحیم الدین صاحب کو بھی ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہی کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب ڈاکٹر صاحب سے بھی اور ایک قدم آگے جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ صرف انہی روایات کو جمع کرنے اور ان کا اشاریہ مرتب کرنے کے خواہاں نہیں جن کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اپنے صدر مجموعہ میں شریک کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ تمام احادیث کو خواہ وہ "متداول ہوں یا غیر متداول، مقبول ہوں یا مردود" اس مجموعہ میں شامل کئے جانے اور ان کا ایک مبسوط اشاریہ مرتب کئے جانے کے متمنی ہیں۔ وہ ہمیں بتاکید اس امر کا مشورہ دیتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو اُن کے اپنے خیال کے موافق "اُن خیالی پردوں کو جو قرآن وحدیث پر پڑ چکے ہیں" اٹھانے کی کوشش میں مشغول نہ کریں۔

اور مکررات کو حذف کرکے ان کی ایک فہرست مرتب کی جائے،
بالکل صاف اور واضح ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مجلس تحقیقات کا غالباً
سب سے پہلا قدم یہی ہوگا کہ وہ ذخیرۂ حدیث میں کانٹ چھانٹ کرنے
یا ہر ایسی چیز کو جو قرآن کے نظام فکر سے مغائر یا ناموافق ہو یا جس نے
سیرتِ رسول کی صحیح تصویر پر پردے ڈال دئے ہوں، خارج کرنے
سے قبل ایسا ہی ایک مجموعہ ترتیب دے۔ قطع و برید کے اسی طریقۂ عمل
کے متعلق اربابِ علم کی رائے طلب کی گئی تھی اور اسی کے متعلق ڈاکٹر
حمید اللہ صاحب صاف گوئی سے محترز ہیں۔ انھیں اس بات کا اندیشہ
ہے کہ اگر موجودہ نسل اس قطع و برید کی طرف رجوع کرے گی تو اس کا یہ فعل
بعد کی آنے والی نسل کے لئے ایسا ہی عمل انجام دینے کی ترغیب کا باعث
ہوگا۔ اس میں اندیشہ کی کونسی بات ہے۔ آنے والی نسل کو بھی غیر قرآنی
مواد کو قطع و برید کرنے دیجئے۔ اس کو اس کا پورا حق حاصل ہے۔ یقیناً ہر وہ
قدم جو حدیث کو قرآن سے قریب تر کرنے کے لئے اُٹھایا جائے گا وہ اسلام
کی راہ میں ایک آگے بڑھنے والا قدم ہوگا۔ اس کے برخلاف جیسا کہ
اب تک ہوتا رہا ہے، کسی موروثی جذبۂ احترام کے تحت محدثین و رواۃ
کی خالی بیچ اور ان کی پشت پناہی کرنا گویا نبی کریم صلعم کو بالارادہ ناقدینِ
اسلام کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر ہم نبی کریم
صلعم کے متعلق کس طرح ان معترضین کے روز افزوں اعتراضات کا جواب
دے سکتے ہیں جو خود "صحاح" کے مستند روایات سے مواد فراہم کرکے

مفہوم کا تعین کیا جائے اور تمام بنیادی قوانین، احکام و ہدایات کو جمع کیا جائے۔ اور پھر دیکھا جائے کہ مطلوبہ تصویر کی تکمیل کے لئے کسی اور چیز کی کمی تو نہیں۔ اگر تصویر مکمل ہو اور اس میں کسی چیز کی کمی نہ ہو تو پھر ان کی یہ قطعی رائے ہے کہ "ایسی صورت میں بغیر کسی فائدہ اور مقصد کے ہمیں اس عظیم ذخیرۂ احادیث کی جانچ کی زحمت اٹھانے کی قطعاً ضرورت نہیں" بظاہر گویا یہ خیال یہاں کارفرما معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ سماجی اخلاقیات کے ایک ضابطہ قانون کی حیثیت سے عمل کرے اور یہ کہ اس کے تصورات کو حیاتِ انسانی کے سماجی پہلوؤں کے سوا کسی اور پہلو سے کوئی سروکار نہیں۔

یہی رجحان مختلف انداز میں ہندوستان اور پاکستان کے حسبِ ذیل اصحابِ علم میں بھی پایا جاتا ہے۔ (۱) مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری، جامعہ ملیہ دہلی (۲) مولانا غلام احمد صاحب پرویز، کراچی (۳) پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب، پرائیوٹ سکرٹری وزیر تعلیم حکومت ہند (۴) مولانا عطاء اللہ صاحب پالوی، جیپرا، اور (۵) مولانا محمد یٰسین صاحب، کراچی۔

مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری ایک مشہور عالم ہیں جو اسلامی تاریخ کی تحقیق سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ وہ احادیث کے سارے ذخیرہ کو ظنی قرار دیتے ہیں و نیز یہ کہ محکماتِ قرآنی کی تفہیم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ان احادیث کی صرف تاریخی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس اہمیت کی خصوصی نوعیت کی کوئی

(۲)

دوسرا گروپ

برخلاف متذکرہ صدا گروپ کے جو ہر موجودہ روایت کو خواہ اُسکی نوعیت کیسی ہی ہو، محفوظ کئے جانے کا حامی ہے، ایک ایسا دوسرا گروپ بھی ہے جو روایات کے سارے ذخیرہ کو غیر موثق اور اسلام کے لئے اسکو غیر ضروری قرار دیکر اس کو مسترد کرتا ہے اور قرآن کو اپنے لئے کافی سمجھتا ہے۔ منجملہ اور لوگوں کے یہ خیال مصر کے ندوہ انصار القرآن کا ہے۔ اس نے اپنے نقطِ خیال کی تائید میں اپنے صدر کے توسط سے ہمارے پاس دو طویل خط روانہ کئے ہیں اور متعلقہ لٹریچر بھی ارسال کیا ہے۔ یہ صورتحال کا انتہائی رُخ ہے، یعنی روایتی اسلام کا ردِ عمل جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ترقی پسند محرکات کی راہ میں حائل ہو رہا ہے اور جس کی بدولت بعض سنجیدہ دماغوں میں مایوسی کا احساس پیدا ہوا اور اس کے بالمقابل صرف قرآن ہی کے سہارے پناہ لینے کی پر زور تحریک معرضِ وجود میں آئی۔

اس وقت مصر میں ندوہ انصار القرآن کے علاوہ قاہرہ کی ابراہیمیہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبد العزیز الاروسی بھی شدت کے ساتھ ندوہ ہی کے نقطِ خیال کے حامی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن کو ہمارے لئے ہر لحاظ سے پوری طرح کافی و وافی ہونا چاہیئے۔ اپنی اس رائے کے تیقن کے لئے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اولاً محکمات و متشابہات کے صریح

مطالعہ سے قبل ہی قبل کیا قرآن کی تاریخ واری ترتیب ممکن ہے؟ یہ چاروں حضرات بھی ندوہ انصار القرآن ہی کے انداز میں گو سختی کے ساتھ نہ سہی مگر پُرزور طریقہ پر اس امر کے مدعی ہیں کہ قرآن ہر لحاظ سے خود مکتفی ہے۔ مولانا محمد یسٰین صاحب کا انداز اس قسم کا ہے کہ انھیں ندوہ ہی کے ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ذخیرۂ احادیث کو "بھڑوں کے چھتے" کے مماثل قرار دیتے ہیں اور متنبہ کرتے ہیں کہ اسے ہاتھ لگانے کی جرات نہ کی جائے۔

عین اس وقت جبکہ یہ مسودہ طباعت کے لئے بھیجا جا رہا تھا موسیو کلاڈ ربنادینی، مولان، فرانس، کا خط موصول ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"حدیث خواہ وہ صحیح اور مستند ہی کیوں نہ ہو، بالکلیہ حدودِ وحی سے باہر ہے وحی صرف خدا کی کتاب 'قرآن' ہی میں موجود ہے۔ خدائے بزرگ و برتر ہماری معمولی سی معمولی ضرورت کو بھی جانتا ہے اور وہ قطعاً ہمیں ایسی نامکمل کتاب نہ دیتا جس میں مزید کسی آدمی کی شرکت کی بھی ضرورت ہوتی خواہ وہ آدمی پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تسلیم کیا جانا ضروری ہے کہ قرآن بالکلیہ خود مکتفی ہے اور ان تمام امور پر حاوی ہے جن کی انسان کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کیلئے ضرورت ہو جو خدا کے پاس پسندیدہ ہے۔ یہ رائے بلا شبہ صرف میری ہی نہیں بلکہ حضرت عمرؓ اور خود نبی کریم صلعم کی ہے۔"

قرآن کی تائید میں ان اصحاب علم کا یہ احتجاجی انداز یقیناً ہمدردی اور احترام کا مستحق ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نقطہ نظر نبی کریم صلعم کے ذہنی عمل کے متعلق ہماری معلومات

وضاحت نہیں کرتے۔ مولانا عطا اللہ صاحب پالوی بھی اس انداز فکر کے حامل ہیں۔ مولانا غلام احمد صاحب پرویز اُس مشہور بلند پایہ کتاب (معارف القرآن) کے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، مصنف اور کراچی کے رسالہ (طلوع اسلام) کی قوتِ محرکہ اور روحِ رواں ہیں۔ ان کا نقطہ نظر بھی مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے نقطہ نظر کے مماثل ہے۔ لیکن یہ ذخیرۂ احادیث کی جانچ اور اس کی چھان بین کی خوبی کو اس لحاظ سے ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اس عہد کی جس میں پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہؓ نے زندگی بسر کی، ایک صحیح تصویر حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کی رائے میں احادیث دین کی تاریخ ہیں۔ لیکن دین نہیں جو اپنی مکمل شکل وصورت میں قرآن میں موجود ہے۔ پروفیسر اجمل خانصاحب بھی قرآن کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ از آن جملہ ان کی ایک اہم تصنیف قرآن کی تاریخ واری ترتیب پر مشتمل ہے۔ ان کی رائے میں "احادیث کی چھان بین کی قطعی ضرورت نہیں ہے"۔ وہ اولاً قرآن کے فہم و مطالعہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "فہم قرآن کے لئے قرآن سے پہلے کی کتبِ الٰہیہ (اور اس کے ساتھ ساتھ کتب شیطانیہ) کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ترتیبِ نزول سے قرآن کو مرتب کرنا ہے۔ پھر سیرتِ نبوی کو قرآنی ادوار کے ساتھ ساتھ مدوّن کرنا ہے۔ اس آخری کام میں حدیث و خبر سے مدد ملے گی اور یہ بہت بعد کا کام ہوگا"۔ لیکن قابلِ غور سوال یہ ہے کہ آیا نبی کریم صلعم کی سوانحی تفصیلات کے

طرف رجوع کرنا ضروری ہے اس لئے کہ نبی کریم صلعم کی تاریخ کے لئے قرآن سے باہر ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہی روایات ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ روایات اکثر و بیشتر غیر موثق اور ظنی ہیں۔ جن کی وجہ سے نبی کریم صلعم کی صحیح تصویر پر ایک پردہ پڑ گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس پردے کو اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ عہد ماضی میں بھی اس امر کی کوششیں کی جا چکی ہیں کہ جھوٹے واقعات سے صداقت کو اور مفروضات سے حقیقت کو علیحدہ کر لیا جائے۔ چونکہ یہ کوششیں غیر تشفی بخش ثابت ہو چکی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس خصوص میں نئے انداز پر از سر نو کوشش کی جائے اور اگر ضرورت ہو تو ہمارے بعد بھی یہ طریقہ کار جاری رکھا جائے تا آنکہ نبی کریم صلعم کی صحیح تصویر پھر ایک بار اپنے صحیح خدو خال کیساتھ منظر عام پر آجائے تو اس کا حقیقی فائدہ صریحاً خود قرآن ہی کو پہنچے گا۔ مجھے قوی توقع ہے کہ ہمارے احباب ندوہ انصار القرآن و نیز انہی کے ہم خیال دیگر احباب اس نقطۂ نظر پر ضرور غور مکرر فرمائیں گے۔

اس گروپ کے چند اصحاب علم جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ضرور اس امر کی تائید میں ہیں کہ ذخیرۂ حدیث کی مکرر چھان بین کی جائے تاکہ اُس عہد کی جس میں نبی کریم صلعم نے اپنی زندگی بسر کی اور اپنا فریضۂ رسالت ادا فرمایا، ایک مکمل تصویر حاصل ہو سکے۔ مولانا غلام احمد صاحب پرویز تو ضرور اس قسم کی تصویر کو "بنی نوع انسان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ" قرار دیں گے۔ لیکن ان اصحاب علم میں سے کوئی بھی اس امر کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں کہ اس سارے مواد کو دین اسلام کے لئے بطور ایک اشاریہ اور قرآنی محکمات

میں ایک خلا ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ قرآن بحیثیت ایک نظامِ حیات یا بطور ایک ضابطہ اصول و ہدایات کے بلاشبہ ہر لحاظ سے کافی و وافی ہے لیکن یہ سوال خود بخود ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کہ کیا قرآنی اصولوں کی تفہیم اور ان کی پسندیدگی میں رسول کی ذات گرامی اور ان کی شخصیت کو ملحوظ نہیں رکھا جانا چاہیئے۔؟ ہر اصول خود اپنی قدر و قیمت کے اضافہ کا باعث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ قابلِ عمل یا عملاً تشفی بخش ثابت ہو۔ قرآن کا لائحہ عمل یا تو تدریجاً نازل ہوا یا رسول صلعم کی زندگی کے واقعات کے تعلق سے وقتاً فوقتاً اس کا نزول عمل میں آیا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ رسول خود اولاً اس پر عمل پیرا ہوں۔ یہ امر کہ نبی کریم صلعم کی شخصی زندگی میں قرآن بہ نفس نفیس کس طرح کارفرما رہا ہمارے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ قرآن نبی کریم صلعم کو ہمارے لئے ایک نمونہ قرار دیتا ہے۔ یقیناً اس بات کا علم کہ پیغمبر نے اپنی شخصی زندگی اور اپنی امت کی زندگی کے حالات میں الفاظ قرآن کو کس طرح عملی جامہ پہنایا کسی طرح دیدہ و دانستہ نظر سے پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ جس طرح ہم قرآن کے معانی و مطالب جاننے کے آرزومند ہیں اسی طرح ہمیں ذاتِ رسالت کو بھی جاننے اور سمجھنے کا متمنی ہونا چاہیئے اس لئے کہ یہی ذات عملاً خود قرآن تھی۔ یہ صحیح ہے کہ خود قرآن میں مجملاً رسول کی شخصیت اور ان کی عملی سرگرمیوں کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن کیا ہم بصورت امکان رسول کے متعلق تفصیلی معلومات سے اپنے آپ کو محروم کر لیں جبکہ یہ معلومات بطور خاص الفاظِ قرآن کی تفہیم میں ہمارے لئے ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ بنابریں ہمیں روایات ہی کی

" کے لئے غیر متغیر ہی رہنا تھا تو ضروری تھا کہ یا تو ان کو قرآن میں "
" شامل اور ضم کر لیا جاتا یا پھر نبی کریم صلعم خود اپنے احادیث کا ایک "
" مصدقہ مجموعہ امت کو عنایت فرمائے ہوتے۔ چونکہ یہ دونوں چیزیں "
" وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ اس لئے بظاہر یہ منشا تھا کہ یہ تفصیلات ہمیشہ "
" کے لئے ناقابل تغیر نہ رہیں۔ قرآن میں عام اصول بیان کرنے کا صرف "
" یہی مقصد تھا کہ ہر نسل خود ان کی ایسی تفصیلات متعین کرے جو اس کے "
" اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اور موزوں ہوں۔ اس طرح "
" دین کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک ایسی شکل اختیار کرے جو "دوام "
" اور تغیر" ہر دو پر مشتمل ہو یعنی دوامی قوانین جو قرآن میں مذکور ہیں "
" اور مختلف بدلتی رہنے والی تفصیلات جو انہی قوانین کی روشنی میں "
" وقتاً فوقتاً بلحاظ زمانہ متعین کی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے آج ان تفصیلات "
" کو جو نبی کریم صلعم کے زمانہ میں متعین کی گئی تھیں معلوم کرنے کی کوشش کرنا "
" قطعی بے سود اور غیر ضروری ہے۔ پھر بھی اگر صحت کے ساتھ ان کو "
" متحقق کر لیا جائے جس کا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، امکان بہت "
" کم ہے، تو ایسی صورت میں وہ صرف اسی مقصد کی تکمیل کر سکیں گی "
" کہ فلاں فلاں عہد میں فلاں فلاں تفصیلات وقت کے تقاضوں کا "
" لازمی نتیجہ تھیں۔ بالفاظ دیگر یہ تفصیلات دین کی تاریخ ہو سکیں گی لیکن "
" خود وہ دین نہیں ہو سکتیں جو اپنی مکمل شکل و صورت میں قرآن میں "
" موجود ہے "۔

کے مطالعہ کے لئے بطور ایک مدد کے استعمال کیا جائے۔ یہ انداز ایسا نہیں کہ بآسانی اس کے ساتھ اتفاق کیا جا سکے۔ وہ عہد جس میں کوئی پیغمبر اپنی زندگی بسر کرتا اور اپنی رسالت کے فرائض ادا کرتا ہے قطعاً ایک ایسا عہد تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس کی رسالت سے غیر متعلق اور غیر وابستہ ہو۔ یقیناً وہ عہد اس پیغمبر کے لئے خاص مفہوم و معانی کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اُسکی پکار سے دوچار ہوتا ہے، اُس کی دعوت پر لبیک کہتا اور اُس کو اپنے قابو میں لاتا ہے اور اس پر اپنی شخصیت کی مُہر ثبت کر کے اس کی تشکیلِ جدید کرتا ہے۔ اُس کی سیرت کی ہر تفصیل اس کی رسالت پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے اور اس کو کسی طرح بھی یہ کہہ کر۔ وہ غیر اہم اور لایعنی ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ بڑی اہمیت اور نزاکت اختیار کر لیتا ہے۔ جب نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ یہ کہا جائے کہ ہمیں نبی کریم صلعم کے متعلق اس امر کی تحقیق و دریافت کی ضرورت نہیں کہ آپ نے قرآن کے ان احکام کی جو عام انداز میں بیان کئے گئے ہیں، کس طرح تعمیل و تکمیل فرمائی، اور یہ بھی کہا جائے کہ ایسے قرآنی ہدایات ہر دور میں جدید اور تازہ تفصیلات کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ تجویز مولانا غلام احمد صاحب پرویز کی پیش کردہ ہے۔

ایک مکتب خیال کے اس مفروضہ کا کہ ایسی صورتوں میں نبی کریم صلعم نے جو تفصیلات متعین فرمائی ہیں وہ ناقابل تغیر ہیں یا وہ ہر زمانہ کے لئے نافذ سمجھی جا سکتی ہیں، جواب دیتے ہوئے مولانا پرویز فرماتے ہیں:-

"یہ مفروضہ تنقیدی معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا۔ اگر تفصیلات کو ہمیشہ"

نبی کریم صلعم نے خود اس کو پسند نہ فرمایا ہو یا آپ کو اپنی انتہائی مصروف زندگی میں اتنی فرصت نہ ملی ہو کہ ان قرآنی احکام و ہدایات کی جو عام انداز میں بیان کئے گئے ہیں، تفصیلات مُدوّن فرمائیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا یقیناً کوئی وجہ جواز نہیں رکھتا۔ کہ اس سے آپ کا یہ منشاء تھا کہ ان تفصیلات کو جونہی کہ آپ وصال فرما جائیں، بالکلیہ جدید تفصیلات سے بدل دیا جائے یاد رکھئے کہ یہ تفصیلات دراصل روزمرہ کے مقررہ معمولات تھے اور غالباً آپ کے اطراف رہنے والے ہر صحابی کو ان کا علم تھا اور ممکن تھا کہ تصوّرات قرآنی کی ہدایت افروز روشنی میں عام طور پر یہ تفصیلات ۔ بدلتے ہوئے زمانے کی ضروریات سے مطابقت کر لیتے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اس کی وجہ وہ المناک ہنگامے تھے جنھوں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ نبی کریم صلعم کی زندگی اور آپ کے عمل کا تاریخی مواد جو ہم تک پہنچا ہے وہ بنا بریں جیسا کہ پرویز صاحب کی رائے ہے "صداقت اور غیر صداقت ہر دو کا آمیزہ ہے۔" لیکن یہ یقیناً ناممکن نہیں کہ اس آمیزہ سے صداقت کو علیحدہ کر لیا جائے اور اس کو قرآن سے مربوط کر دیا جائے

اب میں اس کے بعد کے گروپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

نظریہ پُرخطر ہے۔ اگر وہ صرف "معاملات" ہی تک محدود ہوتا تو ممکن تھا کہ پیش کردہ تجویز اُن جدت پسند رجحانات کا جن پر اس یادداشت میں اس کے بعد بحث کی گئی ہے اور جو اس وقت مشرق وسطیٰ میں کارفرما ہیں اور جن کا مقصد قانون کو مذہب سے علیحدہ کرنا ہے، ایک جزو قرار دیجا سکتی اور اُس نقطۂ نظر سے اس نظریہ کا بھی جائزہ لیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس تجویز کا مقصد عبادات کے حدود میں و نیز زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی مداخلت کرنا ہے یا کسی قسم کے منطقی عواقب کا ان پر اطلاق کرنا ہے، تو اسلام کے لئے ممکن ہے کہ اس کے نتائج نہایت المناک ثابت ہوں۔ اس خصوص میں معقول پسندانہ اقدام یہ ہو سکتا ہے کہ اولاً تحقیق کے ذریعہ اس امر کا پتہ چلایا جائے کہ حقیقت میں وہ کونسی تفصیلات تھیں جن کو نبی کریم صلعم نے قرآن کے مجوزہ ہر عام حکم یا قانون کے تحت متعین فرمایا تھا اور ان تفصیلات کو متعین کرنے کے آپ کے کیا اصول تھے۔ اور پھر یہ تصفیہ کیا جائے کہ کس طریقہ پر ان کو ہمارے زمانہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعاً کوئی مفید اور صحت بخش طریقہ عمل نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ہمیشہ ورجعت پسندوں کے مقابلہ میں صف آرا کرلے اور ان کو لفظ بہ لفظ اور ترکی بہ ترکی جواب دے اور اس طریقہ عمل سے انتہا پسندوں کے مقابلہ میں خود بھی انتہا پسند بن جائے۔ اگر رجعت پسند حضرات یہ کہیں کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی جو روایات میں پیش کی گئی ہے، وہ ناقابل تغیر اور تمام زمانوں کے لئے لازم ہے تو اس کا جواب یہ نہیں جو بالکلیہ اس کے برعکس اور متضاد ہو۔ اگر

بلکہ وہ اپنی طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے اس کام کو ایک عالمانہ جدوجہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ وہ نتائج تحقیق کو جن مقاصد کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ بنیادی طور پر اُن مقاصد سے مختلف ہیں جو اکیڈمی کے پیش نظر ہیں۔ اس تجویز سے ہمارا اصلی مقصد افکار اسلامی کو قرآنی تصورات کی روشنی میں موجودہ دنیا کے لئے ایک نئے اسلوب میں ڈھالنا ہے لیکن پروفیسر فیضی صاحب اور بالخصوص سلیمان صاحب کا واضح طور پر مقصد یہ ہے کہ افکار اسلامی کو جدید مغربیت کی روشنی میں از سر نو تشکیل دیا جائے اس طرح کہ اسلام محض ایک روحی معاملہ بن کر رہ جائے۔ چنانچہ سلیمان صاحب لکھتے ہیں :—

"خرافات و روایات کے انبار سے خالص سونے کو علیحدہ کرنے کی"
"کوشش یقیناً ایک مستحسن کوشش ہے۔ ذخیرہ حدیث کے متعلق جس"
"کام کی تجویز کی گئی ہے وہ ایک طویل المیعاد اور مفید عالمانہ کام"
"ہے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ اس کے اغراض و مقاصد قبل از قبل ہی"
"واضح طور پر متعین نہ کر لئے جائیں، افکار اسلامی کی تشکیل جدید ناقابل"
"حصول ہوگی اور موجودہ عام مذہبی بحران نے اسلام کے لئے خالص"
"غیر مذہبی اور معقولی اساس پر ایک قطعی راہ اختیار کرنے کے جو"
"نادر مواقع مہیا کئے ہیں وہ بھی ضائع ہو جائیں گے۔ جوش اور ہمت"
"کے ساتھ بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے کہ دنیائے"
"اسلام کی ناموافق صورتِ حال میں کل قلب ماہیت اور کایا پلٹ"

(۴)

تیسرا گروپ

متذکرۂ صدر دونوں گروپوں سے ہٹ کر ہم اصحاب علم کا ایک ایسا تیسرا گروپ بھی پاتے ہیں جنھیں صرف "روح" یا "جوہر" اسلام ہی سے سروکار ہے۔ اس گروپ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک کی نمائندگی پروفیسر اے، اے، فیضی صاحب کرتے ہیں جو پبلک سروس کمیشن حکومت ہند کے رکن ہیں۔ اور دوسرے کی نمائندگی احمد امین یلمان صاحب کرتے ہیں۔ جو استنبول کے اخبار "وطن" کے مدیر ہیں۔ اور کسی وقت اتاترک مرحوم کے قریبی رفیق کار رہ چکے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب ایک ہی طرزِ فکر کے دو مختلف پہلوؤں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پروفیسر فیضی صاحب جہاں مذہب کو قانون سے اس طرح علیحدہ کرنے کے آرزومند ہیں کہ موخر الذکر کو "عہد حاضر کے مفکران قانون کے مقرر کردہ اعلیٰ معیاروں" اور اول الذکر کو بشمول عقائد "تنقید معنوی (Higher Criticism) کے اصولوں" کے تابع رکھا جائے، وہاں یلمان صاحب اس امر کے متمنّی ہیں کہ اسلام کے اس سارے ڈھانچے کو جس کا تعلق قانون اور مذہب سے ہے نظر انداز کر دیا جائے اور ایک "نیک پاکباز زندگی" کے لئے اسلام کی اصل "روح" پر اکتفا کر لیا جائے۔

یہ دونوں حضرات ذخیرۂ حدیث کی از سر نو چھان بین کے مخالف نہیں

" برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کو ارسطا طالیس کے الفاظ میں "
" یہ کہہ سکیں گے، ایک باقی رہتا ہے اور متعدد بدلتے اور گزر جاتے ہیں "

پروفیسر موصوف کی یہ رائے جیسا کہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں قطعی طور پر ملت اسلامیہ کے موجودہ انتشار و پراگندگی میں مزید اضافہ کا باعث ہو گی۔ محض اس امید پر انتشار پیدا کرنا کہ کوئی مستحکم نظام بتدریج وجود میں آ ہی جائیگا۔ یقیناً وہ ایسا صحیح طریقہ کار نہیں جو اعتقاد کی روح پھونک سکے۔ ایسا کرنا گویا اپنے ہاتھوں تباہی مول لینا ہے۔ بہر حال جو امر بطور خاص غور کرنے کے قابل ہے وہ ان کا اپنا قانون کو مذہب سے جدا کرنے والا اہم اصول ہے جس پر ان کی ساری تجویز کا دارومدار ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

" سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مذہبی عقائد و نظریات کو معقولی طریقہ پر "
" قانونی اصول و آئین سے علٰحدہ کر دیا جائے۔ میں اس کو ایک امر بدیہی "
" بھی سمجھتا ہوں کہ آدمی کا اصل ایمان قواعد و قوانین کی ظاہری پابندی "
" سے علیحدہ کوئی اور چیز ہے۔ اخلاقی اصول کا اطلاق ضمیر پر ہوتا ہے "
" لیکن قانونی قواعد صرف حکومت ہی کے ذریعہ نافذ کئے جا سکتے ہیں "
" اخلاقی معیارات داخلی ہوتے ہیں اور قانونی قواعد خارجی۔ روح کی "
" باطنی زندگی یعنی "تصورِ ذاتِ الٰہ" کو ایک حد تک سماجی آداب کی "
" ظاہری شکلوں سے علیحدہ ہونا چاہیئے۔ یہ علیحدگی کچھ آسان نہیں "
" بلکہ ایسا کرنا بھی غیر اسلامی تصور کیا جائیگا۔ لیکن شریعت پر غور و فکر کی "
" کوشش کا آغاز صرف اسی اصول کے تسلیم کئے جانے پر منحصر ہے۔ "

ہو جائے"

آئیے اس گروپ کے نقطۂ نظر کو اور ذرا قریب سے دیکھیں

پروفیسر فیضی صاحب اپنے مقالہ "ہندوستان میں اسلامی قانون اور مذہب" میں جس کا ایک نسخہ انہوں نے ازراہ کرم مجھے بھی عنایت فرمایا ہے۔ دورِ حاضر کے لئے شریعت کی تعمیر جدید کے نام سے ایک آزمائشی تجویز پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی تجویز کو دو حصّوں یعنی بنیادی اصول اور عملی اصول میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور ان کے تحت زاویہ ہائے نگاہ کی ایک ایسی تفصیلی فہرست پیش کرتے ہیں۔ جن سے ان کی رائے میں شریعت کو مکرر جانچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"اگر شریعت کے سارے ڈھانچے کو اس تنقیدی طریقہ پر جانچا"
"جائے تو ظاہر ہے کہ مذہب کے مسلّمہ اور مستحکم شکلوں کے علاوہ"
"اور ایسی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں گی جو ممکن ہے کہ مختلف ممالک میں"
"ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوں اور ان میں سے بعض تو"
"کوتاہیوں اور خامیوں سے بھی مملو ہوں۔ لیکن ان سے تدریجاً ایک"
"ایسا واضح سوچا سمجھا ہوا اصول حقیقی صورت میں معرضِ وجود میں"
"آئے گا جو سائنٹفک طریقہ پر اسلام کی تشریح مکرر کے لئے ایک"
"اساس کا کام دے گا۔ اس قسم کی نئی توضیح ایسے بہت سارے دل"
"کے لئے تسکین و تقویت کا باعث ہوگی جو مذہب کی مسلّمہ رسمی توضیحات"
"سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ہنوز اسلام کے جوہرِ اصلی سے اپنی وفاداری"

تحریک کو مرحوم شیخ محمد عبدہ کی تحریک تجدید کی ایک ترقی یافتہ صورت تصور کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد اسلام اور دور جدید کے بہترین اصولوں کو اس استدلال کے تحت کہ بنیادی طور پر اسلام اور مغربی ثقافت وتہذیب میں کوئی آویزش نہیں ہے، باہم مربوط کرنا تھا۔ ڈاکٹر سنہوری کا مقصد شریعت کے جزو عبادات کو معاملات کے دیوانی اور تعزیری اجزا سے علیحدہ کرنا اور موخر الذکر کی مندرجہ ذیل طریقہ پر جانچ پڑتال کرنا ہے:۔

(۱) "ان مغربی قانونی قواعد واصول کو اختیار کیا جائے جو اسلامی قانون کے دائرہ سے باہر ہیں یعنی ان معاملات میں جہاں شریعت خاموش ہے اور جن پر مغربی قانون حاوی ہے وہاں مغربی قانون اختیار کیا جائے۔"

(۲) "وہ مغربی قانون اختیار کیا جائے جو اصولاً قانون اسلام کے موافق ہے اگرچہ کہ قانون اسلامی میں اس کی اتنی تفصیلات وصاحت کے ساتھ موجود نہیں کہ وہ موجودہ زندگی کے ان حالات سے جو مغربی اثرات کے تحت رونما ہوئے ہیں، مطابق ہو سکے۔ موجودہ زندگی کے اُن جدید حالات کے لئے جو اسلامی قانون کے مخالف یا اس سے متصادم ہونے والے نہیں ہیں مغربی قانون اختیار کیا جائے۔"

(۳) "شریعت کے وہ قوانین جو متروک الاستعمال ہو چکے ہیں ان کی جگہ مغربی قانون اختیار کیا جائے۔"

اِس اصول کی اتباع میں وہ منجملہ اور سوالوں کے مندرجۂ ذیل سوالات پیش کرتے ہیں :—

"قانونِ شریعت کی موجودہ حیثیت کیا ہے ؟ وہ عہدِ حاضر کے مفکرین"
"قانون کے مقرر کردہ اعلیٰ معیاروں کے مقابلہ میں کہاں تک ناکافی"
"ہے ؟ کس طریقہ پر ان قوانین کی ترمیم، تنسیخ یا توثیق کی جا سکتی"
"ہے اس طرح کہ وہ سماجی انصاف کے جدید تصورات پر منطبق ہو سکیں"
"اور عام طور پر عالمی سماج کا ایک جزو لاینفک ہو کر مسلمانوں کی سماجی"
"خوشحالی کو آگے بڑھا سکیں ؟"

پروفیسر فیضی بظاہر مشرقِ وسطیٰ کی تجدد پسند تحریکات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جہاں ، جیسا کہ پروفیسر مجید قدوری صاحب نے جو جان ہاپکنس یونیورسٹی میں شعبۂ "مڈل ایسٹرن اسٹیڈیز" کے پروفیسر ہیں ، اپنے مقالہ "غیر مذہبیت اور قانونِ اسلامی" میں جو پرنسٹن یونیورسٹی کے موتمر اسلامی میں پیش کیا گیا تھا اور جس کو یہاں بطور حوالہ استعمال کرنے کی پروفیسر موصوف نے اجازت بھی دی ہے ، تبلایا ہے "قانونِ اسلامی کے پہلو بہ پہلو مغربی قوانین کے نفاذ نے ان دونوں کی باہمی آویزش سے بچنے کی خاطر ان ہر دو نظام قوانین میں امتزاج پیدا کرنے کا سوال کھڑا کر دیا ہے"۔ وہاں قانونِ اسلامی کو غیر مذہبی بنانے کی تحریک خاص طور پر ڈاکٹر صنہوری کی جدید قانونی تصنیف یعنی مصر شام اور عراق کے لئے ان کا اپنا تیار کردہ ضابطہ دیوانی کے توسط سے برسرِ عمل ہے۔ اس

"ایک چالو کھاتہ کا کام دے سکیں بلکہ اس کا مفہوم ایک صالح "
"ایماندار زندگی ہونا چاہیئے۔ کہاں تک اور کس طرح ہم اپنے نفس کی "
"تادیب اور تربیت کے لئے نمازیں ادا کرتے ہیں یہ ہمارا اپنا ایک "
"شخصی معاملہ ہونا چاہیے جس کے لئے ہم راست خدا کے سوا کسی "
"اور کے آگے جوابدہ اور ذمہ دار نہیں ہیں یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ "
"وہ تمام خود ساختہ درمیانی حضرات جو اپنے آپ کو خدا اور انسان کے "
"درمیان واسطِ نجات قرار دے لیتے ہیں، فریب دہندے ہیں "
"جو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر مصروف بہ کار ہیں۔ اسلام کسی مسلمان "
"کو دوسرے مسلمان کے اعمال کی جانچ کی اجازت نہیں دیتا۔ اس "
"کا حکم ہے کہ بدلتے ہوئے زمانہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے۔"
"ان بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں اس کا امکان "
"ہے کہ اسلام کی اصلی روح کے وفادار اور اس سے وابستہ رہتے "
"ہوئے بھی ایک نہایت ہی عمدہ اور عصری مذہبی تصور قائم کیا جاسکے۔"

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ پروفیسر فیضی صاحب اور سلیمان صاحب ہر دو میں سے کسی نے بھی نہ تو اس امر کی وضاحت کی کوشش کی کہ 'روحِ اسلام' یا 'جوہر اسلام' سے کیا مراد ہے' اور نہ یہ بتلایا ہے کہ کس طرح اور کس مواد کے ذریعہ اس کو ہماری نگاہوں کے روبرو لایا جاسکتا ہے اور نہ یہ کہ اس میں اور عہد حاضر کے آرام پسند احباب کی اصطلاح "فطری اخلاقیات" میں کیا فرق ہے اور اس سے کس طرح متیمز ہے؟

جہاں اس تحریک کا مقصد صرف جزوی طور پر قانون اسلام کو مغربی قانون سے بدلنا ہے وہیں احمد امین یلمان صاحب کا رحجان یہ ہے کہ اسلام کی پوری مشینری کو اصل راہ سے ہٹا دیا جائے اور صرف روحِ اسلام کو ملحوظ رکھا جائے۔ وہ کہتے ہیں :-

"ہر وہ ملک جہاں مسلم آبادی کی کثرت ہو، وہ ترکی کی طرح اس امر"
"پر مصر ہوگا کہ ایک غیر مذہبی حکومت اختیار کی جائے، مذہب کو سیاسی"
"قانونی اور علمی مباحث سے علیحدہ رکھا جائے، اس کے تمام شہریوں"
"کو مساوی مواقع دئیے جائیں اور یہ کہ وہ کسی ایسی پالیسی کی اتباع"
"کرنے میں جو اس کے اپنے گرد وپیش کے حالات اور اس کے اپنے"
"تحفظ کے پیش نظر نافذ کی گئی ہو، اپنے آپ کو آزاد پائے۔ ہمیں"
"اس کی ضرورت نہیں کہ ہم اقتدار اور معقولیت کی باہمی آویزش کے"
"ان پہلوؤں پر غور کریں جو مغرب میں رونما ہیں۔ سائنٹفک معاملات"
"میں ہمیں معقولیت کا ساتھ دینا چاہیئے اور مذہبی طرز فکر کے ساتھ"
"کوئی سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔"

"ہمیں اسلام کے لئے ایک خالص روحانی میدان تیار کرنا چاہیئے"
"ہمیں اپنی ترقی کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی پڑے گی تاکہ ہم اپنے"
"آپ کے شایانِ شان ہو سکیں اور ایثار و اخلاص کو عمل میں لاسکیں"
"مذہب کا مفہوم یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ میکانی طریقہ پر نمازیں اس طرح"
"ادا کی جائیں کہ وہ خدا کے پاس اپنے گناہوں کے معاوضہ میں"

"وہ مذہب کے موجودہ قانونی ضوابط میں سے ایک ایسا جامع قانونی ضابطہ
مرتب کرے جو سارے ملک میں قانونی تعلقات کو موثر طریقہ پر منضبط کر سکے"
یہ بھی صحیح ہے کہ فقہ اسلامی کے مختلف مکاتیب خیال کے نمائندوں کے
ایک سالہ مباحث کو "وقتاً فوقتاً کئی ایک پیچیدگیوں اور رکاوٹوں کا سامنا
کرنا پڑا اور بالآخر یہ مباحث بغیر کسی نتیجے کے اختتام کو پہنچے"۔ لیکن کیا یہ
کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ ان مباحث کے نتیجہ خیز نہ ہونے کی بنا پر،
ناعاقبت اندیشی کے ساتھ سوئٹزانی ضابطۂ دیوانی، اطالوی ضابطۂ فوجداری
اطالوی والمانوی بری وبحری تجارتی قوانین، نیوشاٹل ضابطۂ قانون اور
دیگر قوانین کی طرف سبقت کی جائے اور احساس کمتری کے تحت اپنے آپکو
ان قوانین کا تابع کر لیا جائے؟ ایک انقلابی حکومت جو شدت کے ساتھ
اس قسم کا انتہاپسندانہ قدم اٹھانے کی مقتدر تھی وہ یہ بھی قدرت رکھتی تھی
کہ اس کام کے لئے وہ کوئی دوسری کمیٹی مقرر کرے۔ اس مرتبہ کمیٹی ایسے مسلم
ماہرین قانون پر مشتمل ہوتی جن کو بطور خاص ہدایت دی جاتی کہ وہ فقہ اسلامی
کے مروجہ روایتی مذاہب کے باہمی اختلافات سے بلند وبالا ہو کر اسلامی زندگی
کے واحد صحیح ترین ماخذ یعنی قرآن ہی کے اصول یا اس کے تصورات کی
طرف رجوع کریں اور قانونِ عامہ کا ایک ایسا ضابطہ تیار کریں جو اُن تمام
قدیم قوانین کا جو باقی رکھے جانے کے قابل ہیں تحفظ کرتے ہوئے مغربی قانون
کے ان تمام اجزا کو جو اُس کے موافق ہیں اپنے اندر جذب کر لے اور
اس طرح وہ اس ضابطہ کے رُخ پر قرآنی اندازِ زندگی کا امتیازی نشان

یلمان صاحب نے حقیقت میں اُس ذہن کی ترجمانی کی ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں انقلاب ترکی کے قائدین کا امتیازی خاصہ رہا ہے جبکہ انہوں نے مروجہ قرون وسطیٰ کی مذہبی رجعت پسندی سے تنگ آکر بالکلیہ مغربیت اختیار کرنے کا تہیہ کرلیا۔

بلاشبہ یہ انقلاب ترکی کی تاریخ میں ایک عظیم واقعہ ہے، لیکن یہ اسلام کی تاریخ میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ عظیم ہوتا بشرطیکہ وہ اختیار کردہ صورت کی بجائے کوئی دوسری صورت اختیار کرتا۔ جمہوری اصول اختیار کرنے کی حد تک قائدین نے وہی عمل کیا جس کی قرآن ہمیشہ توثیق کرسکتا ہے۔ مفوضہ کام نہایت ضروری اور اہم تھا اور نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۴ء کے عام انتخابات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جمہوریت کی بنیادیں سرزمین ترکی میں مستحکم ہوچکی ہیں اور جو ترکوں کے لئے باعث عز و افتخار ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت کو سرے سے نظر انداز کردینا اور ساتھ ہی مغربی قانون کو اس کی جگہ اختیار کرلینا کیا اتنا ہی ضروری اور ناگزیر تھا؟ کیا اس مسئلہ کو پرسکون حالات میں غور کرنے کے لئے اس وقت تک اٹھا نہیں رکھا جا سکتا تھا جبتک کہ جمہوریت پوری صلاحیتوں کے ساتھ کارفرما نہ ہوجاتی اور اپنے آپ کو ترکی عوام کی حقیقی آواز ظاہر کرنے کے موقف میں پاتی؟ یہ سچ ہے جیسا کہ استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر حفظی تیمور صاحب فرماتے ہیں کہ دورِ انقلاب کے ارباب حل و عقد نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ:-

جاری رہے گا جب تک کہ ان تمام قوانین کو جو مغربی قانون سے مستعار لئے گئے ہیں، قرآنی لمس سے پاک نہ کر لیا جائے اور ان کو اسلام کے نام اور اسلام کی مہر کے ساتھ رائج نہ کر دیا جائے۔ کیونکہ مغرب کی کوئی بھی چیز اسلام کے منافی نہیں ہوگی اگر اس کو اس طرح ڈھال لیا جائے کہ وہ قرآنی تصورات کے سانچے میں ٹھیک بیٹھ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو واپس لوٹانے کا رجحان یا ترکی عوام کی یہ خواہش کہ اسلام سے ان کے دلی تعلق اور جذباتی وابستگی کا تحفظ کیا جائے، تو اس پر بڑی احتیاط سے نگرانی کرنی ہوگی اور ان کو ایسی راہ پر لگانا ہوگا جو انھیں قرآنی نظریۂ حیات سے قریب تر رکھے اور انھیں دور وسطیٰ کی اس ظلمت پسندی میں جس سے وہ پہلے نجات پانے کے آرزومند تھے، دوبارہ مبتلا ہونے سے روکے۔ وہ ظلمت پسندی جو ان مخالفِ قرآنی تصورات کی بدولت فروغ پا رہی ہے جو من گھڑت اور موضوع روایات کو نبی کریم صلعم کی طرف منسوب کرنے سے معرضِ وجود میں آئے۔

یلمان صاحب کا یہ خیال کہ "مذہب کو سیاست، قانون اور سائنس کے مباحث سے علیحدہ رکھ کر ہم کو اسلام کے لئے ایک خالص روحانی میدان تیار کرنا چاہئے" یا پروفیسر فیضی صاحب کا پیش کردہ موضوعی اصول کہ "آدمی کا اصل ایمان، قواعد و قوانین کی ظاہری پابندی سے علیحدہ کوئی اور چیز ہے"۔ اور یہ کہ اس لئے قانون کو مذہب سے علیحدہ رکھا جانا چاہیے، ایک ایسا وسیع موضوع ہے جس پر علیحدہ بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ

یا تصدیقی مہر ثبت کریں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یقیناً ترکی کو سارے عالمِ اسلام میں ایک عظیم انقلابی تحریکِ اجتہاد کی قیادت حاصل ہوتی جس کا نتیجہ موجودہ زمانے کے تعلق سے افکار و حیاتِ اسلامی کی مسرت بخش تشکیلِ جدید کی صورت میں نمایاں ہوتا، اس لئے کہ اُس وقت ترکی قطع نظر اس کے کہ اس نے خلافت ترکیہ کا انسداد کر دیا تھا، پھر بھی ساری دنیا کے مسلم عوام کے لئے اس کا نام سحر انگیز اور جادو اثر تھا۔ لیکن اس کے حکمرانوں نے اس نایاب موقع کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔ وہ اس وقت اپنی انفرادی محویت میں بہت زیادہ گم ہو گئے تھے۔

یہ موقع ہنوز باقی ہے۔ ترکوں کے دلوں میں اسلام اور جذبۂ اسلامی ہنوز موجزن ہے۔ وہ اپنی مملکت کو جمہوری بنانے میں اپنے قائدین کا ساتھ دے سکتے تھے اور واقعتاً انہوں نے آخر تک ان کا ساتھ دیا کیونکہ یہ تحریک ان کے جذبات و احساسات کے غیر منافی ہونے کے باوجود عین اسلامی روایات کے مطابق تھی۔ لیکن مذہب کے میدان میں وہ بہ رضا و رغبت اپنے قائدین کے ساتھ مماثل انداز میں پیش قدمی نہیں کر سکتے تھے۔ گزشتہ چند سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترکوں کی زندگی میں ہنوز مذہب ایک ایسا عنصر ہے جو ہر طرح قابلِ لحاظ ہے۔ پروفیسر تیمور صاحب خود اس کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ خود اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ کیوں ترکی کے جدید نظامِ قانون میں چند ترمیمات کی گئیں اور کی جا سکتی ہیں۔" ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ یہ طریقۂ عمل اس وقت تک

سماجی عدم مساوات کو اس مطالبہ کے ساتھ کہ تمام ایک ہی صف میں دوش بدوش برابری کے ساتھ خدا کے روبرو کھڑے ہوں، مساوی رتبہ و حیثیت پر لے آتی ہے۔ اس طرح اسلام میں زندگی کا مقصد ایک مکمل وحدت ہے جہاں زندگی کی قدریں اس کے ہر عمل کے لئے ضروری روحانی پس منظر مہیا کرتی رہتی ہیں۔ اس تصورِ حیات کے تحت قانون اور مذہب میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور ایسے اصطلاحات مثلاً 'غیر مذہبی قانون' 'غیر مذہبی حکومت' اور 'غیر مذہبی زندگی' کوئی معنی و مفہوم نہیں رکھتے۔

یہ ملحوظ رہے کہ اصطلاح 'غیر مذہبیت' کا ماخذ پروٹسٹنٹ عیسائیت کی تاریخ میں دستیاب ہوتا ہے جو پاپائی (رومی) کلیسا کی "پادریت" کی مخالفت تھا اور اس لئے اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات میں، جہاں پادریت اپنی ہر شکل میں ممنوع ہے، کوئی صحیح اور جائز مقام نہیں رکھتا۔ چند دنوں سے اس اصطلاح کی ایک نئی تعبیر کی جا رہی ہے یعنی یہ کہ دنیوی معاملات کی بغیر کسی مذہبی تاثر کے دنیوی طریقوں ہی سے تنظیم کی جائے۔ لیکن کیا کوئی نظامِ حیات خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دنیوی کیوں نہ ہو، زیادہ عرصہ تک باقی اور برقرار رہ سکتا ہے اگر وہ کسی روحانی قانونِ حیات پر مبنی نہ ہو؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ مغرب کی یہ نام نہاد غیر مذہبیت حقیقت یا تخیلی نتیجہ کے اعتبار سے یونانی رومی عیسائیت کے اقدارِ حیات سے گہری طور پر وابستہ ہے اور یہ کہ یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ کسی قسم کے بھی مذہب سے اسکا کوئی لگاؤ نہیں ہے؟ پروفیسر تیمور صاحب اپنے آپ کو اس نظریہ سے

یہ سوال اٹھایا گیا ہے اس لئے اس ضمن میں یہاں صرف اتنا بتلا دینا کافی ہوگا کہ یہ تصورِ حیات قرآنی تصور کے اعتبار سے کسی اساس یا بنیاد کا حامل نہیں۔ اسلام میں "ایمان بلا عمل" کی کوئی مسلمہ حیثیت نہیں۔

قرآن کا اسلام محض ایک عالم تصور یا مذہبی آداب و رسوم یا مجرد اصول کا ایک ضابطہ نہیں۔ درحقیقت اسلام نام ہے ایک خاص اندازِ فکر اور اندازِ زندگی کا۔ وہ ایک ایسے خاکۂ حیات کا نام ہے کہ اگر اس کی پوری پوری اتباع کی جائے تو آدمی بلحاظ تعلقات اپنے آپ سے اور دوسروں کے ساتھ امن و امان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ قرآن کی ہدایت ہے کہ "ایمان لاؤ اور عمل کرو"۔ یہ ضروری ہے کہ نظری عقائد کے مفروضہ اقدارِ زندگی کو مناسب و موزوں عمل کا جامہ پہنایا جائے۔ اس طریقہ عمل کا نام اسلام ہے، اور یہ فرد کو نمایاں شخصیت عطا کرتا ہے اور سماجی ماحول میں ایک نمایاں تہذیب کو ابھارتا اور اسی کی بنیادوں پر ایک مخصوص تمدن کو تشکیل دیتا ہے۔ اس طریقۂ عمل میں روح اور جسم علیحدہ علیحدہ حصوں میں اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کرتے۔ وہ دونوں ہر حالت میں اپنے اور سماج کے تعلق کے لحاظ سے باہمی اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز جس کو ملیمان صاحب اور فیضی صاحب کسی فرد کا خالص ذاتی معاملہ قرار دیں گے، وہ قرآنی اسکیم میں محض ایک غیر موثر داخلی حالت کا نام نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ روح کے ایک عمل اور سماجی اخلاقیات کی ایک اچھی تربیت کا نام ہے بلاشبہ یہ اپنی اجتماعی شکل میں ایک سماجی ادارہ کا کام کرتی ہے اور تمام

تشکیلِ جدید کی جائے۔ اور اگر اس طریقۂ عمل میں مغربی قانون کے کسی دفعہ کو بھی اس میں شریک کر لئے جانے کی ضرورت محسوس ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآنی تصورات میں ہر اس چیز کو جو اس کے موافق ہے یا اس کے بنیادی اخلاقیات کے منافی نہیں ہے، اپنے میں جذب کر لینے اور اپنا لینے کی بڑی گنجائش موجود ہے، اور کیوں نہیں؟ کیا یہ نبی کریم صلعم کا ارشاد نہیں ہے کہ "علم مسلمانوں کا کھویا ہوا مال (اونٹ) ہے، اس کو جہاں کہیں پاؤ واپس لے لو"۔ مغربی قانون میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو مزاج اور اصول کے اعتبار سے تصورات قرآنی کے لئے قابلِ قبول ہیں۔ بہرحال نبی کریم صلعم کی یہ ہدایت کہ "لے لو اس کو جو پاک اور صاف ہو اور چھوڑ دو اس کو جو ناپاک اور گندا ہو" ہر ایک کو ہوشیار اور چوکس رکھنے کیلئے ہر وقت موجود ہے۔

اپنانے اور جذب کرنے کے اس طریقۂ عمل میں جس فرق کو ملحوظ رکھا جانا چاہیئے وہ مذہب اور قانون کے درمیان نہیں اس لئے کہ قرآنی تصورِحیات میں یہ فرق قیام پذیر نہیں ہو سکتا۔ وہ فرق جو قرینِ عقل ہے وہ ایمان اور عمل، اور روح اور اس کے مظاہر کے درمیان ہے۔ یہ دونوں باہم مل کر دینِ یعنے مذہبِ اسلام کو تشکیل دیتے ہیں جس کا مظاہراتی عمل دو صورتیں اختیار کرتا ہے۔ ایک عباداتی اور دوسرا معاملاتی۔ جو چیز اس عمل کی توضیح کرتی اور اس میں ترتیب و تنظیم پیدا کرتی ہے وہی قانونِ اسلام ہے۔ کوئی اگر چاہے تو اس کے عباداتی جز کو معاملاتی جزو سے جو خالص عباداتی حدود کو چھوڑ کر عوامی زندگی کے ہر میدان پر محتوی ہے، علیحدہ کر سکتا ہے۔ معاملاتی قانون

بہلا سکتے ہیں کہ "ترکی میں جو ایک عام قانونی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی وہ کسی ایک مذہب کی قانونی مشینری سے دوسرے مذہب کی قانونی مشینری کی طرف منتقلی کا نتیجہ نہیں تھی اس لئے کہ مغرب کے قانونی عدالتی طریقے ایک غیر مذہبی نوعیت کے ہیں۔ اور مذہبی قانونی دفعات سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہوگا کہ کسی قانونی نظام کی امتیازی نوعیت اس کی قانونی مشینری نہیں ہوا کرتی اس لئے کہ یہ مشینری انتظامی ضروریات اور سہولتوں کے مدنظر وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔ بلکہ وہ دراصل وہ بنیادی اصول ہوا کرتے ہیں جو اس کی نمایاں خصوصیت کا اظہار کرتے ہیں اور جو وقت کے تقاضے یا ضروریات کے پیش نظر اس کے تفصیلات میں تبدیلی اور مکرر تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ یہ معاملہ بطورِ خاص عرب ممالک کے ان احباب کیلئے جو ترکی کی اتباع میں مغربی غیر مذہبیت کو اپنی سرزمین میں منتقل کرنے کے آرزومند ہیں، نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا ہے اگر اسلامی قانون جیسا کہ وہ ایک ہزار سال قبل مدوّن ہوا متصادم ہونے والی متضاد روایات کے ایک نہایت ہی پیچیدہ جال میں پھنسا ہوا نظر آرہا ہے اور اسی وجہ سے وہ مسلمانوں کے لئے موجودہ دنیا کے تعلق سے غیر تشفی بخش ثابت ہو رہا ہے تو اس کی اصلاح کا صحیح طریقہ یہ نہیں کہ اسکو بالکلیہ مغربی قانون سے بدل دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کو روایات کی گرفت سے نجات دلائی جائے اور تصوراتِ قرآنی کے بنیادی اصولوں کے مطابق اس انداز میں کہ وہ وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے، اس کی

اس صورت حال کا اوّلین باعث یہ امر ہے کہ انحطاط کے اس طویل دور میں مختلف مذاہب فقہیہ میں سے کسی ایک کی جانب سے بھی مشترکہ طور پر یا منفرداً اسلام کے قانونی قواعد کو متاثر کرنے والے اسباب کے مطالعہ کی شاید ہی کوئی منظم کوشش کی گئی ہو۔ یہ بات بھی نہیں کہ اسلامی فقہ کی روح اور اس کے اصول جیسے کہ وہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مرتب کئے گئے تھے کسی جدید تشریح و توضیح کے مخالف تھے خواہ یہ جدید توضیح قانون سے تعلق رکھنے والے نصوص قرآنی ہی سے متعلق کیوں نہ ہو۔ فی الحقیقت جیساکہ ڈاکٹر صبحی محمصانی صاحب نے اپنے مقالہ "فقہ اسلامی کی موجودہ سماجی ضروریات پر تطبیق" میں جو موتمر پرنسٹن یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا اور جس کا عربی ترجمہ صاحب موصوف نے ازراہ کرم میرے پاس بھی روانہ فرمایا ہے، یہ بتلایا ہے کہ تین مخصوص صورتیں ایسی ہیں جن میں اکثر خلفاء اور فقہا نے تفسیر و توضیح میں تبدیلی کی اجازت دی ہے۔ وہ صورتیں مختصراً حسب ذیل ہیں :-

اوّل۔ شدید ضرورت کی صورت میں یا مفاد عامہ کی خاطر۔

دوم۔ جب کسی قانونی قاعدہ کی علت یا علتِ غائی معدوم ہو جائے یہ علم اصولِ فقہ کا مسلمہ اصول ہے کہ کوئی قانونی قاعدہ جو کسی علت پر مبنی ہو تو اس کا وجود اس علت کے باقی رہنے پر منحصر ہے۔

سوم۔ جب کوئی قانونی قاعدہ کسی رسم یا رواج پر مبنی ہو اور یہ رسم و رواج وقت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہوں تو متنِ قانون کی مختلف طریقہ سے تعبیر کی جا سکتی ہے اور نتیجتہً بغرض اتباعِ رسم

یا قانون عامہ تو اس پر علیحدہ عمل کیا جا سکتا ہے اور ایسا کیا جانا چاہیئے اور ضروری ہے کہ ہر صورت حال کے تعلق سے اس کی جدید توضیح و تشریح کی جائے۔ اس کی گنجائش قرآن میں پہلے ہی سے موجود ہے کہ ایسے امور 'مشاورت' یعنے باہمی صلاح اور مشورہ سے طے کئے جائیں۔ لیکن ضروری ہوگا کہ ہر ترتیب جدید کو ان داخلی اصولِ حرکت کی طرف رجوع کیا جائے جو تصوراتِ قرآنی میں مضمر ہیں اسلیئے کہ تشکیلِ جدید یا اجتہاد ہمیشہ اصلاح کی خاطر ان پوشیدہ صلاحیتوں کو منکشف کرتا ہے جو کسی شئے میں پہلے ہی سے موجود رہتے ہیں، لیکن اس سے اصل کی تنسیخ یا اس پر کسی اور شئے کا تسلط مقصود نہیں ہوتا۔ اس طریقۂ عمل میں سماجی انصاف کے جو بھی قرآنی معیار استعمال کئے جائیں گے وہ مغربی معیاروں کے مقابلہ میں جیسا کہ پروفیسر فیضی صاحب کو اندیشہ ہے، کسی طرح بھی غیر مکتفی اور کم تر ثابت نہیں ہوں گے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اجتہاد کسی وقت اسلامی قانون کے نشو و ارتقاء میں ایک مؤثر عامل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اہل سنت کے چار فقہی مذاہب اسی اجتہاد کا نتیجہ تھے۔ سقوطِ بغداد کے بعد ۱۲۸۴ء میں بابِ اجتہاد کی مسدودی دراصل فقہ اسلامی کے انحطاط کا اصل باعث ہوئی۔ باوجود اس کے کہ سنجیدہ علما کی جانب سے وقتاً فوقتاً بابِ اجتہاد کے مکرر کھولے جانے کی سفارش کی گئی لیکن ہنوز فقہ اسلامی کو بھی ایسی آزادی نصیب نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنی صحت کو بحال اور اپنی تازہ توانائی کا مظاہرہ کر سکے۔

چکھائی جائے یا مادّی زندگی بسر کرنے کے ایسے معیاروں سے رُوشناس
کرایا جائے جن کو وہ اس وقت تک قائم و برقرار نہیں رکھ سکتے جب تک کہ
وہ اپنے آپ کو مغرب کی دوامی حاشیہ برداری کے سپرد نہ کردیں۔ یہی وہ
خطرہ ہے جو اس صورتِ حال میں مضمر ہے اور اس کا موثر طریقہ پر اس طرح
مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان امدادی منصوبوں سے حاصل ہونے والے
فوائد کو ان مقاصد، اصول اور اقدارِ حیات کی طرف رجوع کر دیا جائے
جن کی قرآنی تصوّرات تائید اور حمایت کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے
قومی انفرادیت کو باقی و برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

قطع نظر مغربی صنعتی دباؤ کے، اس وقت مسلمانوں کے قانون اور
ان کی زندگی کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اس خصوص میں سابقہ
مصلحین و مجتہدین کی مساعی بڑی حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ یہ موجودہ
نسل کا کام ہے کہ وہ ان کے کاموں کو زندگی کے موجودہ تقاضوں کی روشنی
میں آگے بڑھائیں لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی ایسے قطعی لائحہ عمل کا آغاز کریں
جو انھیں اپنے حقیقی مقام پر لوٹ آنے کے قابل بنا سکے، انھیں اولاً یہ ضروری ہوگا
کہ وہ مغربیت کے حملوں سے مدافعت کرتے ہوئے اور اسکے صدموں اور جھٹکوں کو
اوپر تیلائے ہوئے انداز میں اپنے میں جذب کرتے ہوئے اپنے آپ کو مضبوط و
مستحکم بنائیں ورنہ ایک ایسے سماجی ماحول میں جو ایک ایسے تاریخی پس منظر پر مبنی اور
قائم ہے جو مغرب کے تاریخی پس منظر سے بالکل جداگانہ ہے، مغربی قانون
اور مغربی زندگی کو جزوًا یا کلًّا خاموشی کے ساتھ اختیار کر لینا بالکلیہ ایک

جدید قانونی قاعدہ کو بدلا جا سکتا ہے؟

جب اسلامی فقہ کے اِن مسلّمہ اصولوں میں بھی تبدیلی کی یہ لچک موجود ہے تو پھر موجودہ زندگی کے تعلق سے عندالضرورت اس کے دفعات کی جدید تعمیر و تشریح میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہیئے یہ وہ اہم کام ہے جس کی فوری انجام دہی اسلامی دنیا کے لئے بیحد ضروری ہے۔ کیونکہ مغربیت ہمارے انتہا پسند علماء و مجتہدین کی آنکھوں ہی کے سامنے و نیز گروپ اول کے ہمارے ان احباب کی نگاہوں ہی کے روبرو جو اپنے عہد وسطیٰ کے نقطۂ نظر میں مزید سختی اور شدت پسندی کے متمنّی ہیں کسی نہ کسی شکل میں روایتی شریعت میں قابلِ لحاظ مداخلت کر چکی ہے اور جب تک اسلامی ممالک کی حکومتوں کی جانب سے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تائید کے ساتھ اس کی رفتار کو عقلمندی سے قابو میں نہ رکھا جائے تو اس کا سارا ڈھانچہ جو پہلے ہی سے بہت کچھ متزلزل ہو چکا ہے، بہت جلد اس قدر منتشر اور پراگندہ ہو جائے گا کہ اسکی شناخت بھی ناممکن ہو جائے گی۔

موجودہ ساعت میں احتیاط کی اور زیادہ ضرورت ہے جبکہ اسلامی ممالک اپنی انتہائی پریشان کن ضروریات کے پیش نظر مختلف معاشی اور صنعتی امدادوں کو جو مغربی ممالک کی جانب سے قائم کی گئی ہیں، قبول کرنے کیلئے مجبور و پابند ہو گئے ہیں۔ ان امدادوں کے تحت ہر ایک متعلقہ صنعتی امداد کیساتھ ساتھ جو منصوبے قائم کئے گئے ہیں وہ اس میلان کے حامل ہیں کہ ان ممالک کے عوام کو جہاں یہ امدادی منصوبے کارگذار ہیں مغربی اقدار کی ایسی چاشنی

بوجھ سے سبکدوش کردیں جنھوں نے اس کے اصول اور مقاصد کو ان کی اپنی شاہراہ سے ہٹا کر انہیں متاثر اور مسخ کر دیا ہے۔

(۵)

مکرر جانچ کی تائید

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ اکیڈیمی کی پیش کردہ تجویز یعنی ذخیرۂ حدیث کی مکرر جانچ اس غرض سے کہ افکارِ اسلامی کی من حیث الکل تشکیل جدید کیلئے راہ ہموار ہو سکے، تو اس کے متعلق جو آراء وصول ہوئی ہیں ان کی کثیر تعداد نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اس تجویز کی تائید کرنے والے حضرات میں (بموجب فہرست ۴) علماء، پروفیسران جامعہ، ارباب قانون، ارباب حل و عقد اور ارباب صحافت شامل ہیں۔

یہ یاد ہو گا کہ تجویز میں چھ امور غور و فکر کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ بجز امر اول کے جس میں ذخیرۂ حدیث کی از سر نو چھان بین کی ضرورت اور قابل قبول احادیث کے ایک واحد مجموعہ کی تدوین کے متعلق رائے طلب کی گئی تھی، مابقی دیگر تمام امور کے متعلق ان اصحابِ علم میں سے کسی نے بھی اظہار خیال نہیں فرمایا اور یہ غالباً اس وجہ سے ہوا ہے کہ دیگر امور مثلاً مجلسِ تحقیق کی تشکیل، فرائض کی تعیین، طریقۂ تحقیق، اور تحقیقاتِ علمی کے انتظامات اور اس کے نتائج کی اشاعت کے لئے سرمایہ کی فراہمی، یہ ایسے موضوعات تھے جن پر صرف اسی وقت غور کیا جا سکتا ہے جبکہ اولاً

بے نتیجہ تقلید اور بھونڈی نقالی ہو گی۔ یہ ان کی تخلیقی استعداد کو معطل و برباد کر دے گا اور ان کو اس قابل نہیں رکھے گا کہ وہ حیاتِ عالم کی کوئی امتیازی خدمت انجام دے سکیں۔ ممکن ہے کہ یہ خود مغربیت کے لئے ایک وبالِ جان ہو جائے۔ کیونکہ یہ نقالی زیادہ سے زیادہ صرف مسلم آبادی کے اُس چھوٹے سے حصے کے لئے مادّی منفعت کا باعث ہو سکتی ہے جو مسلم سماج کے حکمران یا اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جو بیشتر امور میں مغربی زندگی کی اچھائی کے بالمقابل اس کی برائی کے زیادہ عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن عوام جو بحالات موجودہ اس تبدیلی سے مادّی فائدہ نہیں اٹھا سکتے گو وہ مختلف طریقوں سے اس کی طرف مائل ہو چکے ہیں، یقیناً اپنا توازن کھو بیٹھیں گے اور اپنی اپنی حکومتوں اور مغرب ہر دو کے لئے ایک دردِ سر اور ایک تکلیف دہ مسئلہ بن جائینگے۔

بدین وجہ مندرجۂ بالا سطور میں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ مغرب سے لی ہوئی ہر جدید یا اختیار کردہ چیز کو قرآن کے اساسی اصولوں اور ایک عام مسلمان کے بنیادی اخلاقی ضرورتوں کے ساتھ مربوط و متعلق کیا جائے۔ یہ ایک قلیل المیعاد انتظام ہو گا اور یہ مسلمانوں کو اس قابل بنائے گا کہ وہ فکر و خیال کی صحت و موزونیت کے ساتھ حالات کا جائزہ لے سکیں۔ لیکن ایک کلّی اور ہمہ گیر اصلاح ہر حالت میں ایک طویل المیعاد طریقۂ عمل ہے اور اس کے حصول کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ قرآنی اقدارِ حیات کو عوام کے درمیان اپنی مکمل صورت اور پوری ہیئت میں کارگزار ہونے کا موقع دیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم قرآن کو ایسی ان تمام روایات کے

قبول کیا جائے جن کی تائید قرآن سے ہوتی ہے اور باقی تمام روایات کو مسترد کردیا جائے۔

تصوّرات قرآنی

یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہمارے مکتوب نگاروں میں سے کسی نے بھی "روشنیٔ قرآن" یا "تصوّرات قرآنی" (Quranic Ideology) کی نہ تو تعریف کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ ذخیرۂ حدیث کی جانچ میں ان دونوں اصطلاحوں کے اطلاق سے ان کا اپنا صحیح مفہوم کیا ہے۔ صرف ایک مکتوب نگار مولانا محمد جعفر صاحب ندوی، رکن ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، نے تصوراتِ قرآنی کی تعیین کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کی ہیں۔ مولانا کو فی الوقت دو اہم کتابوں کی تصنیف کا امتیاز حاصل ہے، ایک "مقامِ سنت" جو انہی کے ادارہ کے سلسلہ مطبوعات میں شائع ہو چکی ہے اور دوسری "ریاض السنت" ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہم کو ابتک ایسی ہزاروں روایات سے سابقہ پڑا ہے جو احادیث کے موجودہ مجموعوں سے خارج کر دئیے جانے کی مستحق ہیں۔" ان کی یہ رائے ہے کہ احادیث کی جانچ پڑتال میں قرآن کی کسوٹی استعمال کرنے سے قبل کئی ایک ایسے امور کا تصفیہ ضروری ہے جو خود قرآن سے متعلق ہیں۔ وہ امور حسب ذیل ہیں:

"(۱) کیا قرآن کے الفاظ کے پیچھے چلنا چاہیے یا اس کی اسپرٹ کو دیکھنا چاہیے؟

"(۲) کیا قرآن کی ساری جزئی اقدار ابدی ہیں یا وہاں بھی کچھ عبوری قوانین موجود ہیں؟"

یہ واضح ہو جائے کہ مخصوص حلقوں میں تحقیق کی ضرورت کو سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔

امر اول کے متعلق جوابات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مجوزہ تحقیق اور معتبر روایات کے ایک واحد مجموعہ کی تدوین کی شدید ضرورت ہے۔ ان حضرات نے جو علومِ اسلامیہ کے میدان میں ایک نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں بطورِ خاص اس ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان میں سے چند اربابِ علم کے نام درجِ ذیل ہیں:۔ مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی جو ایک عرصۂ دراز تک شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے صدر اور کسی وقت جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے شیخ الجامعہ بھی رہ چکے ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، صدر ندوۃ العلماء و شبلی اکیڈیمی لکھنؤ، مولانا محمود بشیرالدین احمد صاحب، امام جماعت احمدیہ ربوہ، پاکستان، شیخ منیر القاضی صاحب، مجلس وزرا بغداد، شیخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تاج، شیخ الازہر قاہرہ اور قاضی القضاۃ و رئیس الہیئت العلمیہ الاسلامیہ شرق اردن۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بعض نے تو اس مسئلہ پر یہاں تک زور دیا ہے کہ "اگر ایسا ہو جائے تو" بالفاظ مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی "قرآن و حدیث میں اختلاف باقی نہیں رہے گا اور تمام امتِ محمدی ایک نقطہ پر جمع ہو جائے گی۔" وہ فرماتے ہیں کہ "احیائے افکارِ اسلامی کی یہی ایک صورت ہے۔"

امر دوم کے متعلق بھی تمام متفق الرائے ہیں کہ ہر روایت کو قرآن یا قرآنی تصورات کی روشنی میں جانچا جائے اور صرف ان ہی روایات کو

(۳) وہ کونسی اقدار حیات ہیں جن کو قرآن پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ نظام حیات انہی پر قائم رہے؟

(۴) قرآن بلحاظ ذات و بہ تعلق صفات منفردہ و مجتمعہ خدا کا کیا تصور پیش کرتا ہے؟ سُنت اللہ کیا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں فطرت اللہ اور خلق اللہ بھی کہا جاتا ہے اور جس کو قرآن دین القیم کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یعنی وہ سیدھی راہ جس کی اتباع ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو ایک طرف اپنے ساتھ اور دوسری طرف عالم خارجی کیساتھ حالت امن میں رہنے کا خواہاں ہو؟ قرآن کا حکم ہے "ایمان لاؤ اور عمل کرو" یعنے ایسا عمل جو ایمان کے موافق ہو۔ قرآنی تصور کے لحاظ سے ایمان باللہ کو اس کے ذات اور صفات کے ساتھ جب عمل کا جامہ پہنایا جائے خصوصاً یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ سنت اللہ میں قرآن کے ارشاد کے مطابق کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، تو اس کی کیا شکل وصورت ہونی چاہیئے یا وہ انسان کے لئے (۱) بحیثیت ایک فرد اور (ب) بحیثیت ایک جزو سماج کس طرز زندگی کی تائید و سفارش کرتا ہے اس طرح کہ وہ (۱) انسان کے بحیثیت انسان اور (۲) سماج کے کامل ہونے میں تقویت کا باعث ہو؟

(۵) نقرہ (۴) ایک اور اہم سوال پیش کرتا ہے۔ قرآن نے اُن صفات الٰہیہ کو جن کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان کا اپنی ذات اور اپنے سماجی تعلقات میں مظاہرہ کرے، بوقت واحد پیش نہیں کیا ہے، بلکہ پیام قرآنی کے جزواً جزواً نازل ہونے کی بناء پر یہ تدریجی طور پر روشناس کرائے گئے۔ کیا اس عمل

"(۳) کیا قرآن کے قصص، امثال وغیرہ بھی ویسے ہی اساس ہیں جیسے کہ اس کے بنیادی اقدار؟"

"(۴) قرآنی اسپرٹ کو دیکھنے کیلئے کونسی عینک لگانی چاہیئے؟ یعنی اس کا موضوع کیا ہے جس کے گرد ساری تعلیمات گردش کرتی ہیں؟"

"(۵) قرآنی اصطلاحات مثلاً مومن، مشرک، اہل کتاب وغیرہ کا اطلاق ہر دور میں یکساں ہے یا اسکے قالب بدلتے رہتے ہیں؟"

"(۶) قرآنی تعلیمات حرکی اور ارتقائی ہے یا ایک خاص مقام پر اور ایک مخصوص شکل میں انسانیت کو کھڑا کر کے الگ ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ"

مذکور الصدر سوالات میں چھٹا سوال کم و بیش پہلے پانچ سوالوں پر محتوی اور ایک لحاظ سے ایک جامع سوال ہے۔ یہ سوال کہ آیا تعلیمات قرآنی ساکن ہیں یا قوت محرکہ کی حامل تو اس کا جواب اس روح کو آشکار کر سکتا ہے جو قرآن کے سماجی اور قانونی دفعات میں کارفرما ہے۔ لیکن یہ ہماری چشم بصیرت کے آگے تصوراتِ قرآنی یا قرآنی نظامِ فکر کی پوری تصویر پیش نہیں کر سکتا۔ تصوراتِ قرآنی کی اس مکمل تصویر تک پہنچنے کے لئے ایک اور زیادہ وسیع اور عمیق طریقۂ فکر کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں مندرجۂ ذیل سوالات قابلِ غور ہیں:—

(۱) قرآن کی رو سے بلحاظِ تعلقِ کائنات انسان کیا ہے؟

(۲) وہ کونسا نظامِ حیات ہے جس کو قرآن انسان کے لئے فراہم یا مستنبط کرنا چاہتا ہے؟

ایک فردِ جماعت کے اور بحیثیت ایک صدرِ مملکت کے خود بہ نفسِ نفیس
کس طرح اور کس جذبہ کے تحت احکام قرآنی پر عمل فرمایا، ہمارے لئے مماثل
حالات میں اس کے منطبق کئے جانے کی اساس مہیا کریگا۔ لیکن اس نمونہ
کی اتباع میں ایک بڑی رکاوٹ حائل ہے۔ قدیم طرز کے علماء کے طبقے بعض
روایات دینیز بعض قرآنی آیات کی تاویل و توضیح کی بناء پر اس امر کے مدعی
ہیں کہ نبی کریم صلعم کا ہر معمولی سے معمولی عمل بھی راست وحی منجانب اللہ کے تحت
سرانجام پاتا تھا۔ اس قسم کی وحی کو احبار یہود کے انداز میں وحی خفی یا غیر متلو
کہا جاتا ہے۔ یہ اُس وحی سے متاثر ہے جو قرآن کی صورت میں موجود ہے
اور جس کو وحی جلی یا وحی متلو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح نبی کریم
صلعم کا ہر خیال اور ہر عمل راست وحی کا نتیجہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تصوّر
نبی کریم صلعم کے مرتبہ کو گھٹا کر آپ کو ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پیش کرتا ہے
جس کے افعال غیر ارادی ہیں اور آپ کی اُس شخصیت کی نفی کرتا ہے جو خود
آپ کو بحیثیتِ بشر حاصل ہے۔ ایسی صورت میں پھر کوئی کس طرح ایک ایسی
ہستی کی اتباع کر سکتا ہے یا اس کی طرح سوچ سکتا اور عمل کر سکتا ہے جبتک
کہ وہ خود کوئی پیغمبر نہ ہو اور اپنی معمولی سی معمولی حرکتِ خیال یا حرکتِ عمل کیلئے
راست خدا کی ہدایت کا محتاج نہ ہو۔ اس دعوی میں اور بہت ساری
پیچیدگیاں مضمر ہیں اور جب تک کہ اس تصور کو راست نص قرآنی کے حوالہ
سے ختم اور تحلیل نہ کر دیا جائے اور اس حقیقت کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ پیغامِ
قرآنی اور اس کے مضمرہ بنیادی اغراض و مقاصد کی اتباع میں نبی کریم صلعم کا ہر فعل

تنزیل کو مختلف دوروں میں منقسم اور ان صفات الٰہیہ کو مختلف گروپوں میں تدریجی ترتیب کے لحاظ سے تقسیم کیا جا سکتا ہے ؟ کیا صفت الٰہی کا ہر جدید انکشاف انسان پر مماثل ذمہ داری عائد کرتا ہے ؟ کیا یہ تدریجی ذمہ داری قرآن کے پیش کردہ احکام میں منعکس ہے ؟ قرآن کا یہ منشا رتھا کہ وہ عہد رسالت کے عربوں کو ایک مثالی امت "امۃ وسطیٰ" میں تبدیل کر دے جو ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ ہو۔ اصلاح یا تکمیل کا ہر عمل، جیسا کہ یہ ہے، ہمیشہ ایک ابتدائی یا عبوری حالت کو نمایاں کرتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی وہ کونسی دفعات ہیں جو اس عبوری حالت سے منسوب کیجا سکتی ہیں اور وہ کونسی جو امت وسطیٰ کی حالت سے متعلق ہیں ؟ اگر ایسا ممکن یا جائز ہو سکے تو اول الذکر صرف تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہونگی اور صرف انسانی تاریخ کے مماثل حالات میں یہ بہتر طریقہ پر منطبق ہو سکیں گی اور انسان کے لئے صرف موخر الذکر ہی ایک عالمگیر کلّی حیثیت اور دوامی قدر و قیمت کی حامل ہوں گی۔

(۶) اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا معیار ہے جس کے ذریعہ قرآن نے بھلائی و برائی، حلال و حرام اور اسی طرح کے دیگر امور میں امتیاز کیا ہے؟

(۷) اسی طرح "اسوۂ حسنہ" یا اعلیٰ نمونہ کردار کا سوال بھی غور و فکر کے لئے سامنے آئے گا۔ قرآنی طریقہ زندگی کا اولین مقصد یہ تھا کہ سب سے پہلے خود پیغمبر اسلام بحیثیت ایک بشر یعنی انسان کے اس پر عمل پیرا ہوں۔ خود نبی کریم صلعم کا یہ عمل کہ آپ نے انفرادی حیثیت سے اور ساتھ ہی بحیثیت

لاحق ہو۔ قرآن میں متشابہات صرف اس لئے ہیں کہ ان کے توسط سے محکمات کے تحت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں زور پیدا کیا جائے۔ اور لہٰذا یہی وجہ ہے کہ خود قرآن محکمات کو "ھُنَّ اُمُّ الکتاب" یعنے وہ قرآن کی اصل و اساس۔ ہیں کہہ کر موسوم کرتا ہے۔ قرآن کے ساتھ جو کتاب مبین ہے" یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ اس کی زبانِ استعارہ و تشبیہہ کا لغوی مفہوم لیا جائے یا کسی پوشیدہ سرّی معنی و مفہوم کے ساتھ اس کی توضیح کی جائے۔ امثال کو بلا تکلف متشابہات میں شمار کیا جا سکتا ہے اور ان ہی امور کا ان پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

(۹) قرآن کا ایک معتد بہ حصہ قصص و حکایات پر مشتمل ہے جو زیادہ تر انبیائے بنی اسرائیل کی زندگی اور ان کے مصائب سے متعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیغام قرآنی کے تعلق سے یہ کس مقصد کی تکمیل کرتے ہیں؟ اس کا اصل مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ بعض ان خیالات و تصورات کی جو بحیثیت پیغمبر اُن کے لئے معیوب اور توہین آمیز تھے اور جو عہد رسالت میں ان کے متعلق جاری و ساری تھے اصلاح کی جائے بلکہ اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ ان کی تاریخ سے نتائج اخذ کئے جائیں اور عبرت حاصل کی جائے اس طرح کہ قرآن کی پیش کردہ صداقت کی مزید تائید و تقویت ہو سکے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآن پر اس امر کی راست ذمہ داری تھی کہ وہ اس صداقت کے صحیح تناظر کو پھر سے بحال کرے اس لئے کہ وہ اُس پیغام کے پیش کرنے کا مدعی ہے جو انبیائے بنی اسرائیل آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسروں کو

اور قول بشر کی حیثیت سے آپ کے اپنے ذاتی اختیار و ارادہ کے تحت
اور بالکلیہ قرآنی خیال یا پیغام کے مطابق تھا اور یہ کہ روایات میں جو کچھ بھی
آپ سے منسوب کردیا گیا ہے وہ قرآن کے الفاظ یا وحی کو قطعاً تبدیل یا منسوخ
نہیں کرسکتا، اس وقت تک اسلام کے لئے خود اس امر کا اعلان ضروری ہوگا
کہ وہ ایک ایسا مذہب ہے جو صرف انبیاء ہی کے لئے مخصوص ہے اور ان
مردوں اور عورتوں کے لئے نہیں جو ہر حرکت کے لئے حصول وحی پر قادر نہیں۔
اگر اس استدلال کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور اسکی پوری پوری تائید نہ کیجائے تو کسی
بھی مجلس تحقیق کیلئے استناد روایات کی تحقیق کا کام اپنے ہاتھ میں لینا ایک فعل عبث ہے
(۸) بیان کیا جاتا ہے کہ قرآنی مواد 'محکمات' اور 'متشابہات' پر مشتمل ہے۔ کیا
یہ تقسیم اسلوب بیان کی اس خصوصیت پر مبنی ہے کہ ایک کا انداز بیان سادہ ہے
اور دوسرے کا تشبیہی و تمثیلی ؟ یا اس تقسیم کا انحصار اُن خیالات کی نوعیت
پر ہے جس کو وہ منفرداً پیش کرتے ہیں ؟ ان ہر دو میں فرق و امتیاز کی وجہ
خواہ کچھ ہی ہو لیکن یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان دونوں کو ایک مشترک مقصد
کی تکمیل یعنی قرآن کے صحیح پیغام کی پیشکش کا ذریعہ ہونا ہے۔ بناء بریں یہ
دونوں نہ تو متصادم ہونے والے نظریات پیش کرسکتے ہیں اور نہ انتشار و
انحراف پیدا کرنے والے خیالات۔ تشبیہہ و استعارہ کا مقصد بشرطیکہ ادب
میں اس سے کسی غرض کی تکمیل مقصود ہو، یہی ہے کہ وہ متخیلہ کو بیدار
کرے اور اس کے توسط سے مصورانہ انداز میں کسی خیال کو اس طرح
گرفت میں لے کہ سادہ زبان میں اُسکے اظہار کیلئے ایک تفصیلی پیرایۂ بیان کی ضرورت

تواس کی صحیح نوعیت اور اس میں اس کا صحیح مقام کیا ہے؟ کیا قرآن تصوف کی مروجہ خیال بندی اور تصور سازی و نیز اسکے متعلقہ اشغال کی تائید و حمایت کرتا ہے؟

(۱۱) کیا تصورات قرآنی کو ایسے موضوعات سے کوئی خصوصی دلچسپی لینی چاہئیے جو مثلاً (ا) فضائل صحابہ، فضائل قبائل، فضائل مقامات، اور فضائل علماء و حفّاظ وغیرہ اور (ب) جو امت کی زندگی میں آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی پیشین گوئیوں سے متعلق ہیں جن سے ذخیرہ حدیث مالا مال ہے؟

(۱۲) کیا تصورات قرآنی "علما" کے جماعتی وجود اور اجماع کے اُس تصوّر کو جو ان کا پیدا کردہ ہے تسلیم کرتے ہیں؟ اگر اس کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر اسلام اپنی تنظیمی شکل میں احبار کی یہودیت کے مماثل ایک ایسی مذہبی حکومت (حکومتِ الٰہیہ) بن جاتا ہے جس میں پیشوایانِ مذاہب برسر اقتدار ہوتے ہیں۔ یہ اسلام پھر کیونکر قرآن کے اُس اسلام کے مساوی رمماثل ہو سکتا ہے جو مذہبی پیشوائیت کی نفی کرتا ہے؟ ایسی صورت میں علماء جو ایک روایت کے بموجب 'ورثۃ انبیاء' ہیں اور پیغام رسالت کے مفہوم و معنی کی حقیقی توضیح کرنے والے ہیں تو ان کا منصب بھی ان یہودی احبار کے مماثل ہو جاتا ہے جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی جانشینی کا دعویٰ کیا تھا اور موسوی قوانین الٰہیہ کی اپنے حسب منشاء توضیح و تفسیر کی تھی۔ کیا تصورات قرآنی علماء کے اس منصب و حیثیت کی تائید کرتے ہیں؟ مثلاً یہ یاد رہے کہ فقہ کے چاروں سنّی ضابطے خلافت اسلامیہ کی مرکزی حکومت کی جانب سے نہیں بلکہ چند ایسے خانگی منفرد اشخاص کی جانب سے مدوّن کئے گئے تھے جنھوں نے

دیا گیا تھا تاکہ اُن کے متبعین میں خالص موحدانہ لطافت کے ساتھ وہ پیغام دوبارہ زندہ کرے اور ان تمام کو ایک متحدہ انسانیت میں مربوط کر دے۔ یہی وہ مقصد ہے جو واضح طور پر اس آیت قرآنی میں پیش کیا گیا ہے :۔ یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ " اے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو سوائے اللہ کے رب قرار نہ دے " (قرآن:۔ سورہ ۳ آیت ۵۷)
یہ ذہن نشین رہے کہ اسرائیلی قصوں کے حوالوں سے قرآن کا مقصد اُن غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا جو اتحاد و یگانگت کی راہ میں حائل تھیں۔ اس کے سوا قرآن ان سے اور کوئی سروکار نہیں رکھتا جیسا کہ اس کا اظہار اُن پابندیوں اور تحدیدوں سے ہوتا ہے جن کو خلیفہ حضرت عمرؓ اور خلیفہ حضرت عثمانؓ نے صحابی حضرت تمیم داریؓ پر عائد فرمائی تھیں جو مشرف باسلام ہونے سے پہلے نصرانی تھے اور اہل مدینہ کی تفریح طبع کے لئے قدیم اسرائیلی قصے اور افسانے بیان فرمایا کرتے تھے۔ یہی قصے اور افسانے مثل دیگر قصوں اور افسانوں کے مختلف راہوں اور واسطوں سے آہستہ آہستہ دبے پانوں روایات اور بالآخر تفاسیر میں داخل ہو گئے۔
(۱۰) کیا تصوف کو قرآنی نظام حیات سے کوئی خلقی تعلق ہے؟ اگر ایسا ہے

عوام سے کسی قسم کی مالی امداد حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ بنا بریں یہ ادارہ اس موقف میں نہیں اور نہ اس کو وہ ضروری مالی وسائل و ذرائع حاصل ہیں کہ وہ ایسے وسیع کام کو اپنے ہاتھوں میں لے۔ اگر صورت حال موافق و سازگار ہوتی تو یقیناً اکیڈیمی اس کام کے لئے اسلامی دنیا کے موجودہ بہترین دماغوں کو یکجا کرنے اور پوری سرگرمی کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھانے کے متعلق تجویز مرتب کرنے کو اپنے لئے موجب عزو افتخار سمجھتی۔ اس یادداشت کے پیش کرنے اور اس سوال کے اٹھانے سے اکیڈیمی کا اصل مقصد یہی تھا کہ ہر جگہ کے مسلم مفکرین کی توجہ وقت کی ایک نہایت اہم اور شدید ضرورت کی طرف منعطف کرائی جائے۔ اس سے مقصد یہ بھی تھا کہ ہمارے علمائے کے ضمیر کو بیدار کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس خصوص میں مسلمانوں کے عندیہ کو معلوم اور ان کی رفتار نبض کا اندازہ کر لیا جائے۔ یہ امر نہایت ہی تشفی اور اطمینان کا باعث ہے کہ وہ حضرات جن سے ایک شدید ردِ عمل کی توقع تھی وہ نہ صرف مصلحتاً خاموش رہے بلکہ ان کے بعض سربرآوردہ چوٹی کے نمائندوں نے علانیہ اپنی نیک تمناؤں کیا تھا اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔

اب یہ اسلامی حکومتوں اور مستحکم مالیہ رکھنے والے تعلیمی ادارہ جات و اوقاف پر منحصر ہے کہ وہ باہم متحد ہو کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس خصوص میں متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے عام مسلمانوں سے چندہ فراہم کیا جائے۔ مولانا محمود بشیر الدین احمد صاحب، امام جماعت احمدیہ ربوہ، نے اپنی جماعت کی جانب سے

اس کے لئے مرکز سے قبل از قبل کوئی مستند حکم یا اس کی اجازت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ اس قسم کے فساد بلطے کیا تصورات قرآنی میں ٹھیک بیٹھ سکتے ہیں؟ اس ضمن میں مزید سوالات کی بھی گنجائش ہے۔

(۱۳) مسائل "خیر و شر"، "حیات بعد الموت"، اور "نجات" کے متعلق قرآن کا کیا تصوّر و رجحان ہے؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جن کو اولاً جانچ لیا جانا ضروری ہے تاکہ ان اجزا کا تعین کیا جا سکے جن کا تصوراتِ قرآنی کی ترکیب میں داخل کیا جانا ضروری ہے قبل اس کے کہ وہ روایات اور فقہ پر منطبق کئے جائیں۔

مجلس تحقیق

وہ اہم مسئلہ جو اس وقت فوری توجہ کا محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اس مجوزہ مجلس تحقیق کی تشکیل کس کے زیر سرپرستی عمل میں لائی جائے اور یہ بالآخر اس کام کے لئے مجلس کے مصارف کی بابجائی کس طرح کی جائے۔ کئی مکتوب نگاروں کی یہ رائے ہے کہ ہماری اکیڈیمی خود اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے۔ اگر ہماری اصل یادداشت کو مکرر ملاحظہ فرمایا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اس قسم کا مقصد کبھی بھی ہمارے پیش نظر نہیں رہا ہے۔ یہ اکیڈیمی ایک رجسٹری شدہ جماعت ہے اور ایسے اصحاب علم پر مشتمل ہے جو ایک متفقہ لائحہ عمل کے تحت تحقیقاتی کام میں مشغول ہیں اور بالاشتراک اکیڈیمی کی مطبوعات کے مصارف برداشت کرتے ہیں۔ اس وقت تک اکیڈیمی نے حکومت یا

ممتاز محقق مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند کی زیر صدارت مجوزہ مجلس تحقیق کو تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

ایک خصوصی تجویز میک گل یونیورسٹی مونٹریال کے انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہاورڈ ریڈ نے پیش کی ہے کہ یونیسکو (UNESCO) کو اس معاملہ میں دلچسپی لینے کیلئے توجہ دلائی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"آپ اور آپ کی کمیٹی یقیناً اس امر سے واقف ہوگی کہ حال ہی میں"
"یونیسکو نے پروفیسر اے۔ جے۔ ونسنک آنجہانی کے ذخیرۂ حدیث کا"
"ایک مکمل اشاریہ مرتب کئے جانے کی حوصلہ مند تجویز کے متعلق اپنی امداد"
"و تائید کا اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یونیسکو آپ کی تحریکات کے"
"متعلق بھی تعمیری تجاویز کا مشورہ دے سکے گی۔"

یہ تمام تجاویز قابلِ غور ہیں۔ موجودہ یادداشت کو حکومت سعودی عرب، جامعہ ازہر، یونیسکو اور ساتھ ہی ساتھ تمام اہم اسلامی تعلیمی ادارہ جات و اوقاف اور حکومتوں کے پاس بھجوایا جا رہا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا ان میں کوئی بھی اس معاملہ میں پیش قدمی کے لئے آمادہ ہے۔ پیش کردہ تجویز اگر حقیقت کا جامہ پہن لے تو تحقیق کے سلسلے میں اکیڈمی کسی بھی مجلس تحقیق کیساتھ جو مناسب و موزوں سرپرستی میں تشکیل پائی گئی ہو، ہمیشہ و ہر وقت تعاونِ عمل کیلئے آمادہ و تیار رہے گی۔

یہ تحقیقاتی کام خواہ کسی بھی واسطہ یا ادارہ کی سرپرستی میں چلایا جائے، لیکن نہایت ضروری ہوگا کہ مجلس تحقیق کی تشکیل و ترکیب میں حد درجہ احتیاط کو

مصارف کی پابجائی میں شرکت کا پیش کش کیا ہے۔ لیکن اس طرح پر چندہ فراہم کرنا ایک تکلیف دہ امر ہے جس میں بہت سارا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کو جلد انجام پانا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ اسلامی حکومتیں یا مستحکم ادارہ جات اور تعلیمی اوقاف ہی اس کی انجام دہی کو اپنے ہاتھوں میں لیں۔ مولوی غلام احمد صاحب نظام آبادی نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ جلالت الملک فرمانروائے سعودی عرب کی توجہ اس غرض کے لئے مدینہ میں ایک مخصوص تحقیقاتی ادارہ کے قیام کی طرف منعطف کرائی جائے اور اس کے مصارف کی پابجائی کے لئے چند ریال کا ایک خصوصی محصول قافلہ ہائے حجاج کے ہر فرد سے وصول کیا جائے۔ ایک اور تجویز حکومت شرق اردن کے محکمہ خارجہ کی طرف سے پیش کی گئی ہے کہ عالم اسلامی کی مالی امداد کے ساتھ جامعہ ازہر قاہرہ، اپنی سرپرستی میں مجوزہ مجلس تحقیق کو تشکیل دے سکتی ہے۔ اس تجویز میں سارا زور مجلس کے مقام اجتماع پر دیا گیا ہے۔ اس خصوص میں پروفیسر سید عبدالوہاب صاحب بخاری، پروفیسر عربی و تاریخ اسلام پریزیڈنسی کالج مدراس، کا یہ خیال ہے کہ کم از کم فی الوقت موجودہ حالات کے پیش نظر مجلس تحقیق کے لئے ایک پرسکون علمی فضا بمقابلہ کسی اور مقام کے ہندوستان ہی میں کسی مرکزی مقام پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ اگر ہندوستان مقام اجتماع قرار پائے تو اس خصوص میں ہماری اکیڈیمی کی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ کی یہ رائے ہے کہ ایسی صورت میں بلحاظ موزونیت اسلام کے مایہ ناز علم و

مذکور الصدر تجاویز اہم اور وزنی ہیں لیکن ان پر بالآخر اس کام کی نوعیت کے اعتبار سے جو مجلس کے تفویض کیا جائیگا، غور کیا جانا ضروری ہوگا۔

چونکہ مجلس کو اپنے تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں زیادہ تر روایات کے اصل متون کی طرف رجوع کرنا پڑے گا بنا بریں میری دانست میں اولاً اس امر کا تعین کرنا ہوگا کہ وہ کونسی روایات ہیں جو (الف) صحیح طور پر تصورات قرآنی کے مطابق ہیں اور نبی کریم صلعم کی سیرت کو قرآنی خاکہ کے مطابق پیش کرتی ہیں، (ب) واضح طور پر کسی نہ کسی شکل میں اُن رجحانات کا اظہار کرتی ہیں جن کے متعلق ناقدین حدیث کا بیان ہے کہ وہ یہودیت، ابتدائی نصرانیت، زرتشتیت، یونانی و رومی افکار و خیالات، اشراقیت، بدھ مت اور ہندی اصنام پرستی کی پیداوار ہیں، (ج) اسلام کے ابتدائی دو صدیوں کی خاندانی قبائلی، اعتقادی اور شخصی کورانہ رقابتوں کو منعکس کرتی ہیں (د) عربوں کے ماقبل اسلام کے ان اعتقادات، رسوم، عادات اور مذاق کے احیاء کو ظاہر کرتی ہیں جن کو نبی کریم صلعم کے عہد میں ممنوع قرار دیا گیا تھا یا جن میں تبدیلی و ترمیم کی گئی تھی، اور (ھ) قوانین فطرت اور انسانی تجربہ کے خلاف یا تصورات قرآنی کے منافی ہیں۔

قبل اس کے کہ مذکورۂ بالا طریق پر مجلس تحقیق اپنے کام کا آغاز کرے یہ ضروری ہوگا کہ اصحاب علم کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو تصورات قرآنی کو اس طرح مرتب کرے کہ وہ مطابقت کے لئے معیار کا کام دے سکے۔ اس کمیٹی کے ارکان ایسے اصحاب علم ہوں جو فنی طور پر اصول تحقیق اور تحقیق کے

ملحوظ رکھا جائے۔ بعض مکتوب نگاروں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ مجوزہ مجلس تحقیق ایسے اصحاب علم پر مشتمل ہو جو اسلام کے تمام فرقہ واری نظریات سے بلند و بالا ہوں یا مولانا محمد جعفر صاحب ندوی کے الفاظ میں کہ یہ حضرات "ہر قسم کی ایت یعنی سنیت، شیعیت، دیوبندیت، بریلویت اور دیگر تمام 'ایتوں' سے پاک ہوں"۔ مولانا محمود بشیر الدین احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی یہ خواہش ہے کہ مجلس تحقیق اسلام کے تمام فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور مولانا محمد اجمل خاں صاحب کی تجویز ہے کہ اس میں یورپی مستشرقین اور دیگر مذاہب کے ارباب علم بھی شریک کئے جائیں۔ چند اصحاب نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ اس مجلس میں علما کو نمائندگی کا موقع نہ دیا جائے۔ ان میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "ممکن ہے کہ ان کی عدم موجودگی سے تحقیقاتی کام نتیجۃً زیادہ فائدہ اٹھائے، اس لئے کہ اگر وہ اس کام میں شریک ہونگے تو وہ ضرور ہمارے ان تمام علمی سائنٹفک اصولوں پر جو غیر جانب داری اور واقعیت پسندی سے متعلق ہیں، پانی پھیرنے اور ان کو بے اثر ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کریں گے اور ممکن ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جائیں"۔ یہ احتمال بعید از قیاس بھی نہیں۔ لیکن عالم اسلام اپنی اسلامی برادری میں اس قسم کے علما، جو ہماری فہرست مویدین میں پیش کئے گئے ہیں، ضرور رکھتا ہے جو اس صلاحیت کے حامل ہیں کہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق بلند کریں اور دوسروں کے مماثل اتنی ہی شدت اور سرگرمی کیساتھ صداقت کی تائید اور حمایت کریں۔

بلا تضیعِ اوقات انجام دینا ہی ہوگا۔ اگر مجلس پوری طرح سرگرم عمل ہو جائے تو میں
یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مجلس کا کام اندرون پانچ سال مکمل ہو جائے گا۔

اِختتام

قبل اس کے کہ میں اس یادداشت کو ختم کروں میں ایک چیز پر
زور دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس وقت مسلمانوں میں جو رجحانات کارفرما ہیں
وہ اس بات کی کوئی قطعی توقع نہیں دلاتے کہ وہ اسلام جو روایات کے زیرِ نگیں
ہے کچھ زیادہ دنوں زندہ رہ سکے گا۔ موصولہ جوابات سے ظاہر ہے اور اسکی
تائید اُس موتمرِ اسلامی کی رودَاد سے بھی ہوتی ہے جو پرنسٹن یونیورسٹی میں
ستمبر ۱۹۵۳ء میں منعقد ہوئی تھی، کہ روایتی اسلام کے متعلق تعلیم یافتہ طبقوں
میں کسی جگہ اور کسی حالت میں بھی خصوصی طور پر کسی قسم کا کوئی جوش اور ولولہ
نہیں پایا جاتا۔ حتیٰ کہ اسلامی دنیا کے قلب یعنی مشرقِ وسطیٰ میں بھی اس کو
بالارادہ علیحدہ اور نظر انداز کر دیا جا رہا ہے اور اس وقت تک اسلام کی
کوئی اور دوسری تنظیم یافتہ صورت معرضِ وجود میں نہیں آئی ہے جو اس روایتی
اسلام کی جگہ لے سکے اور ایک سہارا دینے والی قوت کی طرح کام کر سکے۔
اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ تن آسان حلقوں میں تصورات قرآنی کے متعلق
بہت کچھ ظاہری وفاداری اور زبانی عقیدت کا اظہار بلکہ اس کا نمائشی
مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے، لیکن کسی متفقہ اساس پر ابھی اُس اسلام کا جسکی
قرآن تائید کرتا ہے، سامنے آنا اور قرآنی صورت میں جلوہ گر ہونا ہنوز باقی ہے

جدید طریقوں میں مہارت اور تقابلی مذہبیات میں دستگاہ رکھتے ہوں اور اس صلاحیت کے حامل ہوں کہ وہ قرآن کے محتویات، اصول اور مقاصد کا تحلیلی جائزہ لے سکیں اور تصورات قرآنی کا ایک جامع خاکہ مرتب اور تنقیدی معیار کے ایسے طریقے مقرر کر سکیں جن کے ذریعہ اُن روایات کو جنمیں قرآنی جھلک پائی جاتی ہے اور اُن روایات سے جنمیں یہ جھلک نہیں پائی جاتی، علیحدہ کیا جاسکے۔ اس ابتدائی کام کی تکمیل کے بعد اس کمیٹی کو مجلس تحقیق کی صورت میں بدل دیا جاسکتا ہے۔ اس کے ارکان کی تعداد میں ایسے اصحاب کی شرکت سے اضافہ کیا جاسکتا ہے جو اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اسلام کی ابتدائی صدیوں کی تاریخ اور ماقبل اسلام عربوں کی سماجی تاریخ کا خصوصی علم اور ساتھ ہی ساتھ اجتماعی اور طبیعی علوم جدیدہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

یہ محض آزمائشی تجاویز ہیں جن پر آئندہ قائم ہونے والی مجلس غور کر سکتی ہے۔ مابقی دیگر امور یعنی تقسیم کار، تعاون عمل، ارتباط باہمی، ترتیب و تدوین، تحقیقات و نتائج کی اشاعت و نیز انتظام دفتر و ضروریات عملہ وغیرہ تو ان امور میں بلاشبہ مجلس اپنے اُس مرتبہ لائحہ عمل کے مطابق کام کریگی جو اس کے اور اس توسط یا ادارہ کے مابین طے شدہ ہوگا جس کی سرپرستی میں مجلس کو اپنا کام جاری رکھنا ہوگا۔ یہ ایک عظیم اور مہتم بالشان کام ہے لیکن ملت اسلامیہ اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ اپنے طریقہ زندگی پر نظر ثانی کرے اور امنِ عالم کیلئے ایک قوت بن کر آگے بڑھے تو اس کو یہ عظیم الشان کام

جذب کر سکے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کو جس قدر جلد ہو سکے پھر سے تصورات قرآنی کے ان عالمی مکمل معیاروں کی طرف رجوع کر دیا جائے جو جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، کبھی بھی کسی اچھی چیز سے خواہ وہ کہیں سے آئے متصادم نہیں ہوتے۔ اس خصوص میں ہمیں انتہا پسند و تقلید پرست حلقوں کی جانب سے بھی کسی موثر مخالفت کے اندیشہ کی ضرورت نہیں جیسا کہ یہ انکے بعض چوٹی کے حضرات کی اختیار کردہ روش سے بخوبی واضح ہے۔ وہ یقیناً اس امر کا حقیقی اندازہ کر سکیں گے کہ روایات میں جو کچھ بھی سونا موجود ہے وہ آنے والے سیلاب میں جو یقیناً مغربی صنائع و فنون کے زیر اثر روایت پرستی پر غلبہ حاصل کرلے گا، اس کھوٹ کے ساتھ جو اس کے ساتھ پیوست ہو چکا ہے، جاتا رہے گا اور اس امر کو تسلیم کریں گے کہ درحقیقت یہ اسلام کی خدمت ہو گی اگر اس سونے کو بروقت بچا لیا جائے تاکہ وہ آج کی دنیا کیلئے قرآنی افکار و حیات کے احیاء میں ممد و معاون ہو سکے۔ اب یہ اسلامی ملکوں کے ان حضرات کا کام ہے جو برسر اقتدار ہیں کہ وہ باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اکیڈیمی کی تجویز کے مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے آگے بڑھیں۔ ورنہ یہ غیبی انتباہ نہایت صاف اور واضح ہے اور یہی سنت اللہ ہے کہ :۔ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" "اللہ کسی قوم کی حالت اسوقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہیں کرتے" (قرآن سورہ ۱۳ آیت ۱۲)

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

نومبر ۱۹۵۴ء

۴۷۰ - آغا پورہ - حیدرآباد دکن۔ ہند

سید عبد اللطیف

اس دوران میں معاملات اپنے حال پر چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اس خصوص میں حکمران یا تعلیم یافتہ طبقوں کی جانب سے اگر کبھی بھی کچھ سوچ بچار کیا گیا ہے تو وہ بھی اس انداز میں کہ روایتی اسلام کے باقی آثار کو ہٹا کر ان کی جگہ مغربیت کو متمکن ہونے کی دعوت دی جائے اور یہ بھی بغیر یہ سوچے سمجھے کہ انجام کار خود اسلام پر اس کا کیا اثر مترتب ہوگا۔ اس تبدیلی سے عوام ہی سب سے زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنے آپ کو مغربی اندازِ زندگی کے مطابق بنانے کے لئے صلاحیت یا مادی ساز و سامان نہ رکھتے ہوں، جبکہ ان کی موروثی روایت پرستی بھی خود ان کی ترقی کے لئے کوئی وجہ تحریک مہیا نہ کرتی ہو اور جبکہ ان کے لئے اسلام کا کوئی ایسا متبادل لائحہ عمل بھی جو بالکلیہ قرآنی قوتِ محرکہ پر مبنی ہو، فراہم نہ کیا گیا ہو تو ظاہر ہے کہ نتیجتہً بہت جلد وہ ایک ایسی نہ زائل ہونے والی بے تسکین حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہوجائیں گے جس سے نجات پانے کا واحد راستہ بجز شاہراہ ماسکو پر گامزن ہونے کے اور کوئی نہ ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس طریقہ عمل کا آغاز ہوچکا ہے۔ اگر ملت اسلامیہ کو امن و سلامتی کے لئے ایک قوت بننا ہی ہے تو یہ صرف اسکے عوام کے ایک مستحکم نقطہ نظر ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس استحکام کو پیدا کرنا یا اس کو فروغ دینا، ان پر مغربیت کو مسلّط کرنے سے نہیں بلکہ خود اس روایتی اسلام کو جس سے وہ وابستہ ہیں پاک صاف کرنے اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے سے ممکن ہے۔ صرف اسی ایک طریقہ سے ملّت اسلامیہ کو اس طرح آراستہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ حاضرہ کے رجحانات کو اپنے اندر

۱۷۔ کرنل حبیب علی۔ بیت الحبیب، ملک پیٹھ
حیدرآباد دکن، ہند۔
۱۸۔ مولوی شیخ محمد اشرف پروپرائیٹر اسلامک
لٹریچر لاہور، پاکستان
۱۹۔ مولوی بشیر احمد سعید جج ہائی کورٹ
مدراس، ہند۔
۲۰۔ پروفیسر اے بطراوی۔ فواد یونیورسٹی
قاہرہ
۲۱۔ پروفیسر آئی۔ آر۔ فہمی، قصر العینی قاہرہ
۲۲۔ مولوی۔ این۔ اے۔ فاروقی، پروین بزنس
روڈ۔ کراچی ۴۔ پاکستان۔
۲۳۔ مولوی غلام احمد وکیل نظام آباد۔
حیدرآباد دکن، ہند۔
۲۴۔ مولوی حبیب الدین احمد۔ خیریت آباد
حیدرآباد دکن، ہند۔
۲۵۔ ڈاکٹر حفیظ سید پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی
الہ آباد۔ ہند
۲۶۔ ڈاکٹر شمران حسین چودھری پروفیسر
جے۔ بی کالج جورہاٹ، آسام۔
۲۷۔ مولانا محمد جعفر ندوی، رکن انسٹیٹیوٹ
آف اسلامک کلچر، کلب روڈ لاہور پاکستان
۲۸۔ پروفیسر محمود بریلوی، ۱۱ : ۱۲ ٹاپ فلور
برسرام۔ پارال بلڈنگ
نمبر ۲۱۳ قریب پنجاب کلب کاردار
کراچی ۲۔ پاکستان
۲۹۔ مولوی محمد عبدالسلام۔ منصف نلگنڈہ
حیدرآباد دکن، ہند۔
۳۰۔ چودھری نذیر احمد خاں سابق وزیر
صنعت وحرفت، ۹۲ گل برگ روڈ
لاہور۔ پاکستان۔
۳۱۔ مولوی محمد قطب الدین احمد۔ تیسیر منزل۔
ملک پیٹھ۔ حیدرآباد دکن
۳۲۔ مولوی محمد ثناء اللہ شریف، ملے پلی
حیدرآباد دکن۔ ہند۔
۳۳۔ مولانا سید شاہ حیدر قادری۔ باغ
محی الدین پاشا۔ حیدرآباد دکن، ہند
۳۴۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی
سلطان جہاں منزل۔ علی گڑھ۔ ہند
۳۵۔ مولوی محمد طفیل شریک مدیر، رسالہ
اسلامک ریویو لندن۔ انگلستان
۳۶۔ مولوی محمد یعقوب، لاٹ ۲۳۹،
جالن پاگاک، مقابل جالنہ اناس
سنگاپور۔ ملایا۔
۳۷۔ مولوی ضیاء الحق، نارائن گوڑہ حیدرآباد ہند

اسٹڈیز، جانز ہاپکنز یونیورسٹی و
ڈائرکٹر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، دی
مڈل ایسٹ انسٹیوٹ ۲۰۰۲ پی اسٹریٹ
این، ڈبلیو، واشنگٹن ٦، ڈی، سی، امریکہ

۲۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی، عزاریہ ۱، بیروت
لبنان۔

۳ پروفیسر حفظی تیمور۔ استنبول یونیورسٹی
استنبول، ترکی۔

گروپ چہارم

وہ احباب جو اکیڈیمی کی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں

۱۔ مولانا عبد القدیر صدیقی، وظیفہ یاب
صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی
ملک پیٹھ، حیدر آباد دکن۔ ہند

۲۔ مولانا عبد السلام ندوی، صدر
ندوۃ العلماء، دار المصنفین، و شبلی
اکیڈیمی، لکھنو، ہندوستان۔

۳۔ مولانا محمود بشیر الدین احمد امام جماعت
احمدیہ، ربوہ مغربی پاکستان

۴۔ ڈاکٹر عبد الرحمن تاج شیخ الازہر
قاہرہ۔ مصر۔

۵۔ شیخ منیر القاضی۔ کونسل آف منسٹرس
بغداد، عراق۔

٦۔ قاضی القضاۃ و رئیس ہیئت العلمیۃ الاسلامیۃ
بتوسط وزیر خارجہ عمان، شرق اردن

۷۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی۔ کلکتہ یونیورسٹی
٦ سہروردی ایونیو سرکس، کلکتہ، ہند

۸۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی ایڈیٹر
"صدق جدید" لکھنو، ہند۔

۹۔ مولانا شیخ عبد اللہ بن عمر با معروف
حضرموت، حال مقیم منگل ہاٹ حیدر آباد ہند

۱۰ ڈاکٹر محمد عبد الحی۔ حیدر گوڑہ۔ حیدر آباد ہند

۱۱۔ ڈاکٹر عبد اللہ الطیب۔ پروفیسر یونیورسٹی
کالج خرطوم، سوڈان۔

۱۲۔ مولوی محمد عبد الجلیل۔ چیف سکریٹری
حیدر آباد دکن (ہند)

۱۳۔ مولانا عبد الودود مانسہروی، گھوڑا گلی
تحصیل مری، راولپنڈی۔ مغربی پنجاب
پاکستان۔

۱۴۔ افضل العلماء پروفیسر سید عبد الوہاب بخاری
پروفیسر عربی و تاریخ اسلام پریسیڈنسی
کالج مدراس، ہند

۱۵۔ مولوی سید عبد الوکیل جعفری، مولوی
فاضل، حسینی علم، حیدر آباد دکن، ہند

۱۶۔ مسٹر احمد کمال۔ سابق وزیر مصر، قاہرہ

اکیڈیمی کی تصنیفات

مطبوعات

(۱) "وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے" از ڈاکٹر سید عبداللطیف (بزبان انگریزی)

(۲) "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" از ڈاکٹر زاہد علی (بزبان اردو)

(۳) "افکار اسلامی کی تشکیل جدید" (ذخیرہ احادیث کی از سر نو جانچ)
مرتبہ:- ڈاکٹر سید عبداللطیف و منظورہ کونسل اکیڈیمی آف اسلامک سٹڈیز (بزبان انگریزی و اردو)

زیر تالیف

(۱) "معاشی انتظام مملکت میں مقام زکوٰۃ" (بزبان انگریزی و اردو)
از:- مولوی نظام الدین احمد انڈین اڈمنسٹریٹو سرویس حیدرآباد

(۲) "اسلام اور سماجی تحفظ" (بزبان انگریزی و اردو) از ڈاکٹر محمد یوسف الدین

(۳) "جنسیت" کا قرآنی تصور" (بزبان انگریزی و اردو) از ڈاکٹر محمد عبدالحی

(۴) "اسلام کی ابتدائی صدیوں کا فن تعمیر و ٹاؤن پلاننگ"۔ (بزبان انگریزی و اردو)
از:- محمد فیاض الدین۔ چیف ٹاؤن پلانر و آرکیٹکٹ حیدرآباد

(۵) "قرآنی نقاط نظر" (بزبان انگریزی و اردو) از:- ڈاکٹر سید عبداللطیف و ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں

(۶) "سیرت نبوی ہم عصر شعرائے عرب کے کلام کی روشنی میں" (بزبان انگریزی و اردو و عربی)
از:- ڈاکٹر عبدالمعید خاں

(۷) "اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام" (بزبان انگریزی و اردو) از ڈاکٹر ناظر یار جنگ

(۸) "خدا اور انسان کا قرآنی تصور" (بزبان انگریزی و اردو) از ڈاکٹر سید وحید الدین۔

زیر طبع

۱۔ "وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے" مترجمہ مولوی عبدالقیوم خان باقی

۲۔ "صحیفہ ہمام بن منبہ" (مع اردو ترجمہ) مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۳۔ "صحیفہ ہمام بن منبہ" (مع انگریزی ترجمہ) مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۳۸۔ ڈاکٹر نجم الحسن۔ گوشہ محل۔ حیدرآباد۔ ہند

رسائل

۱۔ اسلامک لٹریچر لاہور۔ پاکستان
۲۔ "دی اسلامک ریویو" لندن۔
۳۔ اخبار "مدینہ" بجنور۔ ہند۔
۴۔ دی "میسیج"۔ دہلی۔ ہند
۵۔ "نوٹس آن اسلام۔ کلکتہ
۶۔ "تجدید عہد" لاہور۔ پاکستان
۷۔ "طلوع اسلام"۔ کراچی۔ پاکستان

مستشرقین

جنھوں نے اس مسئلہ سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے

۱۔ پروفیسر جے۔ این۔ ڈی اینڈرسن پروفیسر اورینٹل لاز۔ لندن یونیورسٹی لندن۔ ڈبلیو۔ سی۔
۲۔ ریورنڈ ایرک بشپ، پروفیسر گلاسگو یونیورسٹی۔ گلاسگو ڈبلیو ۲۔
۳۔ ڈاکٹر کینیتھ کراگ، ایڈیٹر "مسلم ورلڈ" ہارٹ فورڈ سیمنری فاؤنڈیشن ہارٹ فورڈ۔ امریکہ
۴۔ پروفیسر ہارڈ ریڈ۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میاک گل یونیورسٹی، ۳۵۲۰ یونیورسٹی اسٹریٹ، مانٹریل۔ کناڈا۔
۵۔ پروفیسر ولیفرڈ کینٹ ول اسمتھ۔ ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میاک گل یونیورسٹی۔ یونیورسٹی اسٹریٹ مانٹریل۔ کناڈا۔
۶۔ ریورنڈ ہیر اللہ اسینلر۔ پرنسپل ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ۔ ہند۔
۷۔ ریورنڈ ڈاکٹر مانٹگومری والٹ، میور انسٹیٹیوٹ، اڈنبرگ یونیورسٹی اڈنبرگ